الرسالہ

Al-Risāla

May 2000 • No. 282 • Rs. 10

طاقت سے دشمن کے اوپر فتح پانا آدھی فتح ہے اور
محبت سے دشمن کے اوپر فتح پانا پوری فتح

The Royal Masjid Agung (1965), Banten, Indonesia

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	40.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	50.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروان ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	80.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	5.00
تاریخ دعوت حق	5.00

مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نشری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	50.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازواج	7.00
ہندستانی مسلمان	50.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفر نامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعہ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ، مئی 2000

خصوصی شمارہ: مشاہداتِ دکن

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110013
Tel: 462 5454, 461 1128
Fax: 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: Islamic Vision
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-Risala Forum international
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of the Islamic Centre, New Delhi, Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana road, Khureji Khas, Delhi-

نئی کتابیں

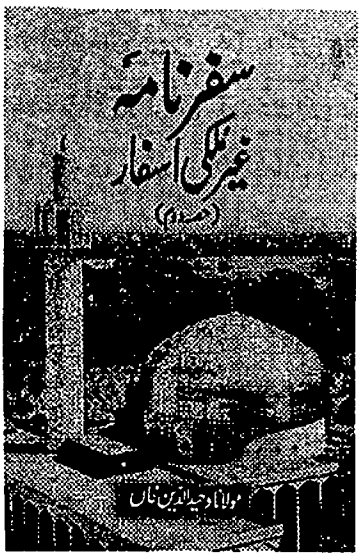

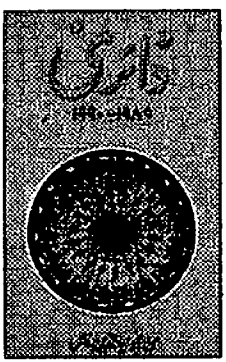

مشاہداتِ دکن

مجلس دعوت اسلامی کے ایک پروگرام کے تحت حیدر آباد دکن اور آندھرا پردیش کے بعض دوسرے علاقوں کا سفر ہوا۔ ۶ فروری ۲۰۰۰ کی صبح کو انڈین ائرلائنز کی فلائٹ نمبر ۹۴۰ کے ذریعہ دہلی سے روانگی ہوئی۔ پروگرام میں شرکت کے بعد ۸ فروری کی صبح کو دوبارہ انڈین ائرلائنز کی فلائٹ نمبر ۹۳۹ کے ذریعہ دہلی واپسی ہوئی۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ ٹھیک انہیں تاریخوں میں ماؤنٹ آبو میں برھما کماری مشن کی طرف سے ایک انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ مجھے اس کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ منتظمین کا سخت اصرار تھا کہ میں اس میں شرکت کروں اور وہاں اسلام کی نمائندگی کروں۔ حتی کہ سفر کے انتظامات انھوں نے میرے رفیق سفر کے ساتھ مکمل کر دئے تھے۔ مگر میں دونوں میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ماؤنٹ آبو کو چھوڑ کر موجودہ سفر کا انتخاب کیا۔ اس انٹر ریلجس کانفرنس میں مجھے اسلام کے نقطۂ نظر سے حسب ذیل موضوع پر بولنا تھا:

Spiritual Empowerment

میرا یقین ہے کہ سب سے بڑی طاقت روحانی طاقت ہے۔ روحانیت آدمی کو سب سے زیادہ طاقتور بناتی ہے۔ مگر روحانی طاقت سے مراد کوئی پراسرار طاقت نہیں۔ یہ ایک معلوم انسانی وصف ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ روحانی وصف پیدا ہو جائے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ تشدد کو استعمال کئے بغیر محض اپنے روحانی کلمات یا اپنے روحانی سلوک سے کسی آدمی کے دل و دماغ پر اتنا اثر ڈالے کہ وہ مسخر ہو کر رہ جائے۔

۶ فروری ۲۰۰۰ کی صبح کو فجر سے کچھ پہلے گھر سے روانگی ہوئی۔ ائرپورٹ روڈ دہلی کی سب سے اچھی سڑک سمجھی جاتی ہے۔ مگر ترقی یافتہ ملکوں کی سڑکوں کے مقابلہ میں وہ ایک معمولی سڑک تھی۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد جو لوگ ہمارے ملک میں حکمراں بنے وہ شاید اس راز کو نہیں

جانتے تھے کہ کسی ملک کی ترقی کے لئے سب سے بڑا عامل اچھا انفراسٹرکچر (infrastructure) ہے۔ یعنی سڑکیں اور اس قسم کے دوسرے معاون وسائل کا معیاری ہونا۔ اچھا انفراسٹرکچر موجود ہو تو آدمی خود ہی ترقی کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر ہمارے پر جوش حکمراں دوسری غیر متعلق سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر پچاس سال گزر جانے کے بعد بھی ملک ابھی تک مطلوب ترقی نہ کر سکا۔

گھر سے ائرپورٹ تک سڑک کے دونوں طرف پھیلی ہوئی عمارتوں کی صورت میں جدید دہلی کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیا ان جدید سرگرمیوں میں مسلمانوں کا بھی کوئی حصہ ہے، تو مجھے محسوس ہوا کہ مسلمان ان جدید سرگرمیوں میں اتنے کم ہیں کہ ان کا کوئی تناسب مقرر کرنا سخت مشکل ہے۔ عام آدمی اس کا سبب حکومت کے تعصب کو بتائے گا۔ مگر یہ سراسر غیر منصفانہ بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری تمام تر خود مسلمانوں کے نااہل لیڈروں پر ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مسلسل غیر متعلق نعروں کی طرف دوڑایا، وہ ان کو نتیجہ خیز کاموں میں مصروف نہ کر سکے۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ساری دنیا میں یہ عجیب و غریب منظر ہے کہ کچھ مسلم رہنماؤں کو شخصی عظمت تو خوب ملی مگر مسلمانوں کو قومی حیثیت سے عظمت نہ مل سکی۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر انھیں حکومت سے ٹکراؤ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ چنانچہ تمام ملکوں میں سطحیت پسند رہنما سو برس سے صرف اپوزیشن کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس طرح عوام پسند باتیں کر کے وہ شخصی عظمت تو حاصل کر لیتے ہیں مگر اب تک قوم کی عظمت کا سامان نہ ہو سکا۔ قوم کی پر عظمت تعمیر کے لئے ضروری تھا کہ ملک میں ایسے رہنما ابھریں جو حکومت اور اکثریت کی نظر میں اعتماد کا درجہ رکھتے ہوں۔ مگر ٹکراؤ کی سیاست کے نتیجہ میں ایسی بااعتماد قیادت کسی بھی ملک میں ابھر نہ سکی۔ تعمیر کے مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔

دہلی ائرپورٹ پر ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہندو مسلم جھگڑے کی جڑ یہ ہے کہ آپ لوگ صرف اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں۔ اگر آپ لوگ بھی ہماری طرح یہ مان لیں کہ اسلام بھی سچا ہے اور ہندو مذہب بھی سچا تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ یہ نظریہ بہت پرانا ہے۔ اسی کو فارسی مقولہ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام۔ مگر یہ ایک غیر فطری فارمولہ ہے۔ میں نے کہا کہ مذہب سچائی کا نمائندہ ہے۔ جب آدمی ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ سمجھ کر اس کو اختیار کرتا ہے کہ اس نے سچائی کو پالیا ہے۔ اس طرح کی دریافت لازمی طور پر یقین چاہتی ہے۔ "ہر مذہب سچا ہے" کہنا خود مذہب کی نفی ہے۔ کیوں کہ سچائی صرف ایک ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا نظریہ بے یقینی پر مبنی ہے اور انسان بے یقینی کے اوپر کھڑا نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا زیادہ درست حل یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے عقیدہ کے مطابق ایک مذہب کو سچا سمجھے اور دوسرے مذہبوں کا احترام کرے۔ یہی اس معاملہ کا فطری حل ہے۔

دہلی ائرپورٹ سے انڈین ائرلائنز کی جو بس ہم کو لے کر جہاز کی طرف چلی اس میں ایک سبق آموز واقعہ پیش آیا۔ بس کے اندر میرے قریب ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ بس کی روانگی سے دو منٹ پہلے وہ اچانک اٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ آج کل کے حالات کے لحاظ سے مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ بس کے اندر کوئی بم نہ چھوڑ گیا ہو۔ میں دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگا۔ میری یہ کیفیت اس وقت تک باقی رہی جب تک کہ بس ہوائی جہاز کے پاس نہ پہنچ گئی اور میں اس سے اتر کر باہر نہ آ گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر غلط فہمی بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔ غلط فہمی پر یقین کر لینا اکثر حالات میں ایک ایسی چیز پر یقین کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے جس کا واقعہ کی دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔

۶ فروری ۲۰۰۰ کی صبح کو جب کہ انڈین ائرلائنز کا جہاز مجھ کو لے کر تیزی سے فضا میں

اڑ رہا تھا، ایک واقعہ گزرا جس کے بعد بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو امنڈ آئے اور فانی بدایونی کا یہ شعر میری زبان پر آگیا:

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

میری عمر اب ہجری کیلنڈر کی رو سے ۸۰ سال ہو رہی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی میں ایسا درجنوں بار ہوا کہ میں نے کسی دل پسند چیز کی طرف مڑنا چاہا مگر خدا نے مداخلت کر کے مجھے کسی بظاہر غیر پسندیدہ چیز کی طرف موڑ دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پوری عمر خدا کے فرشتے میرے ساتھ رہے ہیں تاکہ میں کسی اور موڑ کی طرف نہ مڑوں بلکہ خدا کے طے کردہ منصوبہ کے مطابق ایک ہی رخ پر چلتا رہوں۔ یہ بڑا عجیب معاملہ تھا جو میرے جیسے عاجز انسان کے ساتھ پیش آیا۔

راستہ میں جہاز کے اندر انڈین ائر لائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (فروری ۲۰۰۰) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون حیوانات کے بارے میں تھا جس کا عنوان یہ تھا: Wild Encounters

اس کے مضمون نگار مسٹر اندر راج اہلو والیا تھے۔ انھوں نے رنتھمبور نیشنل پارک کی سیاحت کی۔ اس اوپن پارک میں انھوں نے مختلف قسم کے جانوروں کو قدرتی ماحول میں دیکھا۔ انھوں نے اپنے ان مشاہدات کو دس صفحہ کے ایک باتصویر مضمون میں بیان کیا تھا۔

اس مضمون کا ایک حصہ شیر کے بارے میں تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ اور دوسرے ۵۰ سیاح چند گاڑیوں پر ایک راستہ سے گزر رہے تھے کہ ایک کھلے مقام پر انھیں ایک شیر ملا۔ یہ شیر راستہ کے کنارے لیٹا ہوا تھا۔ خارجی دنیا سے بے پروا وہ اپنے آپ میں مطمئن نظر آتا تھا۔ یہ ایک نر شیر تھا۔ اس نے ہمارے قافلہ کو اس طرح ٹالریٹ (tolerate) کیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا:

And then, finally we saw him, lying full stretch just off the track, at ease with himself, a big male tiger that tolerated us more than I had imagined possible.

جہاز اپنے وقت پر حیدر آباد پہنچا۔ اس بار یہاں کے ائرپورٹ پر کچھ نئی چیزیں دکھائی دیں۔ میں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ حیدر آباد کے ائرپورٹ کو ماڈرنائز کیا گیا ہے۔ اس بار اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ "ائرپورٹ" کی سطح پر انڈیا ترقی کر رہا ہے لیکن "بیل گاڑی" کی سطح پر ملک ابھی تقریباً وہیں ہے جہاں وہ پچاس سال پہلے تھا۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ انڈیا کی ۷۵ فیصد آبادی ابھی تک انہیں قدیم حالات میں رہتی ہے جہاں اب بھی زندگی کا سفر بیل گاڑیوں کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔

حیدر آباد ائرپورٹ پر کئی لوگ موجود تھے۔ حبیب بھائی حیدر آباد سے باہر تھے۔ چنانچہ ان کی نمائندگی ان کے صاحبزادہ محمد احمد صاحب نے کی۔ ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہو کر حبیب بھائی کے مکان (بیگم پٹ) پر پہنچا جو ہوائی اڈہ سے قریب ہے۔ یہاں بہت سے ساتھی اکٹھا ہو گئے اور ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

مولانا اسحاق کمال صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا میں انسان بظاہر مکمل طور پر بااختیار ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ اتنا ہی مجبور ہے جتنا کہ سورج، چاند اور دوسری مادی چیزیں۔ اس دنیا کی ہر چیز کامل عجز کے مقام پر ہے۔ انسان کو بھی اسی کا ثبوت دینا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسری چیزیں مجبورانہ عجز کے مقام پر ہیں جب کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اختیاری عجز کا ثبوت دے۔ وہ خدا کی قدرت کاملہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کامل کا ادراک کرے۔ میں نے کہا کہ انسان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ شعور قدرت کے مقابلہ میں شعور عجز کی دوسری انتہا (extent) بناتا ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ داعی جب دوسروں کو خطاب کرتا ہے تو گویا کہ وہ دوسرے سے یہ مطالبہ کر رہا ہوتا ہے کہ تم حق کا اعتراف کرو۔ ایسی حالت میں داعی کا عمل اسی وقت پوری طرح نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود اعتراف کا ثبوت دے چکا ہو۔ دعوت کا عمل اعتراف خویش سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد وہ اعتراف غیر تک پہنچتا ہے۔ جو داعی خود بے اعترافی

کی سطح پر جی رہا ہو اس کا دعوتی کلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کی لیڈری ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

حبیب بھائی کی رہائش گاہ پر لوگوں سے دیر تک اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے اپنے تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ اب حیدر آباد کے اور پورے ملک کے مسلمان عملاً آپ ہی کہ فارمولہ پر چل رہے ہیں۔ اگر چہ بہت کم لوگ ہیں جو زبان سے اس کا اعتراف کرتے ہوں۔ میں نے پوچھا کہ وہ فارمولہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خود آپ کے الفاظ میں وہ فارمولہ یہ ہے ـــــ مسائل کو نظر انداز کرنا اور مواقع کو استعمال کرنا۔

ڈاکٹر محمد ظہیر احمد (پیدائش ۱۹۶۳) سے میں نے پوچھا کہ آپ اپنا کوئی تجربہ بتایئے۔ انھوں نے ایک عالم کا نام لیتے ہوئے کہا کہ میں نے ان کی تقریر سنی۔ ان کی ایک بات مجھے پسند آئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے مل کر رہنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں، کیوں کہ مجھے اس قول میں بزدلی کی بو آتی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ مل کر رہنا چاہئے مگر اس کا سبب ہندستان کے مخصوص حالات نہیں ہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہی انسانیت کا اعلیٰ اصول ہے اور یہی اسلام کا تقاضہ بھی۔ مل کر رہنے کی روش ہم کو بر بنائے اصول اختیار کرنا ہے نہ کہ بر بنائے مصلحت۔

محمد عبدالرؤف صاحب (پیدائش ۱۹۴۵) الکٹری سٹی بورڈ حیدر آباد میں ملازم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بورڈ کے احاطہ میں ملازمین کی سہولت کے لئے ایک مسجد اور ایک مندر کی تعمیر کی گئی۔ ایک سال پہلے مسجد کے اوپر پلاسٹک کی شیٹ ڈالی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس پر آر سی سی کی باقاعدہ پختہ چھت بنائی گئی۔ چھت کا اصول یہ ہے کہ تعمیر کے بعد اس پر پانی ڈالنا بہت ضروری ہے، ورنہ چھت کمزور ہو جاتی ہے۔ اتفاق سے اگلا دن اتوار کا تھا، کوئی مسلمان وہاں پانی ڈالنے کے لئے نہ پہنچ سکا۔ وہاں پاس ہی مندر کا ہندو پجاری رہتا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ چھت پر پانی ڈالنے کے لئے کوئی نہیں پہنچا ہے تو وہ خود پائپ لے کر چھت کے اوپر چڑھا اور حسب قاعدہ اس نے چھت پر اپنے ہاتھ سے پانی ڈالا۔

اس واقعہ کو سن کر میں نے کہا کہ یہ ہندو اور مسلم کی بات نہیں بلکہ یہ فطرت کی بات

ہے۔ حدیث کے مطابق، ہر انسان صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ فطرت میں پیدائشی طور پر یہ بات شامل ہے کہ ایک دوسرے کی خدمت کی جائے۔ یہ فطری جذبہ ہر ہندو اور ہر مسلمان کے اندر ہے۔ وہ پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔ میں نے اپنی نوجوانی کی عمر میں دیکھا ہے کہ اس ملک کا ہندو اور مسلمان اسی فطرت پر جی رہا تھا۔ ہر ایک دوسرے کے کام آکر خوش ہوتا تھا۔ مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ ہندستان میں انتہائی نااہل اور ناعاقبت اندیش لیڈر اٹھے۔ انھوں نے نفرت کی بولی بول کر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو فطرت سے ہٹا دیا۔ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں جو فرقہ وارانہ جھگڑے آپ دیکھ رہے ہیں وہ فطرت سے اسی انحراف کا نتیجہ ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ ان نااہل لیڈروں نے میرے نزدیک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ جرم ہے — اپنی بے جا مداخلت سے خدا کے قائم کئے ہوئے فطری نظام کو بگاڑنا۔ حیدر آباد سے کئی اخبار نکلتے ہیں۔ ان میں سے ایک روزنامہ سیاست ہے۔ سیاست کے شمارہ ۶ فروری ۲۰۰۰ میں ایک خبر اس طرح تھی:

قونصل جنرل عزت مآب افضل امان اللہ صاحب نے بتایا کہ امسال ایک لاکھ بیس ہزار ہندستانی حجاج کرام حج کا مقدس فریضہ ادا کرنے جدہ تشریف لائیں گے۔ یہ تمام حجاج کرام ہندستان کے مختلف شہروں سے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو کر جدہ انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اتریں گے۔ (صفحہ ۲)۔

اس خبر سے معلوم ہوا کہ اس سال ہندستانی حاجیوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ یعنی تقریباً اتنی ہی جتنی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر اصحاب رسول کی تعداد تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو یہ ہدایت کی کہ تم لوگ تمام اقوام عالم کو میری طرف سے اسلام کا پیغام پہنچا دو۔ میں نے سوچا کہ پیغمبر اسلام کی یہ آواز آج بھی حجاز کی فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ اگر یہ حاجی وہاں پہنچ کر اس آواز کو سن سکیں اور صحابہ کی طرح اس کی پیروی کریں تو دوبارہ جدید تاریخ میں اسلام کی توسیع واشاعت کا وہی کام انجام پانے لگے جو دور قدیم میں انجام پایا تھا۔

حیدر آباد آندھرا پردیش کی راجدھانی ہے۔ یہاں کے قیام کے دوران بار بار اس کے

مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا اور بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ شہر ہر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آیا۔ یہاں کے مسلمان بھی تقریباً سب کے سب ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر حالت میں پہنچ چکے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ۵۰ سال پہلے پیدل یا بائسکل پر چلتے تھے۔ اب ان کے گھر کے سامنے موٹر کار کھڑی ہوئی ہے۔ ایک مسلمان جن کے والد صاحب قدیم حیدر آباد میں صرف ایک بوسیدہ مکان مین رہتے تھے۔ آج انہوں نے پانچ منزلہ شاندار بلڈنگ کھڑی کرلی ہے۔ ایک اور مسلمان جن کے دادا صاحب نے قدیم حیدر آباد میں کرایہ کے ایک چھوٹے سے مکان میں زندگی گذاری، آج شہر میں ان کے چار بڑے بڑے مکانات ہیں۔ ایک اور مسلمان جن کے والد معمولی سروس کرتے ہوئے وفات پاگئے آج وہ ایک بڑی فیکٹری کے مالک ہیں۔ قدیم حیدر آباد میں صرف چند تعلیمی اور اسلامی ادارے تھے آج یہاں درجنوں کی تعداد میں بڑے بڑے تعلیمی اور اسلامی ادارے قائم ہیں، وغیرہ۔

میں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کے حیدر آباد کو بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ کے بعد کے حیدر آباد کو بھی۔ پچھلے سو سال کے درمیان حیدر آباد کی مسلم سیاست کا خلاصہ بیان کیا جائے تو وہ صرف ایک ہوگا ـــــ یہاں کی مسلم ریاست کو کسی نہ کسی طرح برقرار رکھنا۔ حتی کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے دور کے لئے بھی مسلمان یہی ناقابل عمل خواب دیکھتے رہے کہ وہ اس ریاست کو ایک علیحدہ مسلم ریاست کے طور پر باقی رکھ سکیں۔ جب قانون فطرت کے تحت ایسا نہیں ہوا تو مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والوں نے شکایت اور احتجاج کی زبان میں لکھنا اور بولنا شروع کردیا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ مسلم ریاست کے دور کے مقابلہ میں آج حیدر آباد کے مسلمان سو گنا زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سادہ سبب یہ ہے کہ مسلم ریاست کے دور میں ہر مسلمان ریاست کے اوپر تکیہ کئے ہوئے تھا۔ ہر مسلمان کی آخری خواہش یہ ہوتی تھی کہ "حضور نظام" کی حکومت میں اس کو کوئی ملازمت مل جائے۔ نئے انقلاب نے اس بھروسہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے اندر ذاتی اعتماد جاگا۔ اب ہر مسلمان ذاتی کوشش کے میدان میں سرگرم ہوگیا۔ اسی

خود اعتمادی کا نتیجہ وہ ترقی ہے جو آج یہاں کے مسلمانوں میں نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا راز خود اعتمادی ہے، نہ کہ کسی کا سیاسی یا غیر سیاسی سہارا۔

۶ فروری کو نماز ظہر کے بعد جامعہ ریاض البنات، ملک پیٹ، حیدر آباد میں خطاب ہوا۔ اس خطاب کے لئے جناب ریاض موسیٰ صاحب مالاباری نے یہ موضوع تجویز کیا تھا "ہندستان میں دعوت اسلام کی حکمت عملی"۔ اس موضوع پر تقریباً ایک گھنٹہ خطاب کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا: اس ملک میں دعوت کے مواقع اتنے ہی ہیں جتنے کہ کسی اور ملک میں۔ اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب سے پہلے برصغیر ہند میں یہ حال تھا کہ ہر دن ہزاروں لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد یہ پراسس رک گیا۔ اس کی وجہ خود مسلمانوں کی تفریقی سیاست تھی۔ میں نے کہا کہ قومی تفریق کا نظریہ سراسر غیر اسلامی نظریہ ہے۔ ہمارا کام تمام لوگوں کو ایک خدا کے دین رحمت میں لانا ہے نہ کہ انہیں مختلف انسانی گروہوں میں تقسیم کرنا۔

جناب ریاض موسیٰ صاحب خالص دعوتی مزاج کے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پہلے تقریر کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ دعوت کا خطاب سب سے پہلے قوم کے بڑوں سے ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اس واقعہ کا حوالہ دیا کہ مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مکہ کے سردار عتبہ بن ربیعہ کے سامنے قرآن سے حم السجدہ کی ابتدائی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ (سیرۃ ابن ہشام ۱/ ۳۱۴) یہ واقعہ بتاتے ہوئے انہوں نے حاضرین سے یہ سوال کیا کہ آج کا عتبہ کون ہے جس کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کیا جائے۔ ایک شخص نے بلند آواز سے کہا کہ اٹل بہاری باجپئی۔ جناب ریاض موسیٰ صاحب نے کہا کہ پھر کیا آپ نے آج کے عتبہ کو قرآن کا پیغام پہنچایا ہے۔ اس پر لوگ خاموش رہے۔

میں جب اسٹیج پر آیا تو میں نے اپنی تقریر اسی بات سے شروع کی۔ میں نے کہا کہ اللہ کی توفیق سے مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے کہ میں آپ کے بقول، وقت کے عتبہ کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کروں۔ میں نے بتایا کہ نئی دہلی کے فکی آڈیٹوریم میں ایک جلسہ تھا جس میں شہر

کے تعلیم یافتہ ہندو بڑی تعداد میں شریک تھے۔ اس پروگرام میں صرف دو مقرر تھے۔ ایک، اٹل بہاری باجپئی۔ اور دوسرا مقرر میں تھا۔ پہلے مجھ کو بولنے کا موقع دیا گیا۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ تک خالص اسلام پر تقریر کی۔ میں نے قرآن کی آیت: وما ارسلناك إلا رحمة للعالمين کو اپنا موضوع بنایا۔ میں نے کہا کہ اسلام ایک رحمت کلچر ہے۔ میں نے قرآن اور حدیث اور سیرت کے حوالے سے بتایا کہ اسلام کس طرح سارے انسانوں کے لئے رحمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

میری تقریر کے بعد اٹل بہاری باجپئی اسٹیج پر آئے۔ ان کی تقریر زیادہ تر سیاسی انداز کی تھی۔ تاہم انہوں نے اپنی تقریر کے آغاز میں میری تقریر پر مختصر تبصرہ کیا۔ انہوں نے کہا: مولانا صاحب، یہ وچار منچ ہے، یہ پرچار منچ نہیں۔ اٹل بہاری باجپئی نے یہ بات اپنے مخصوص انداز میں کہی۔

اٹل بہاری باجپئی کا یہ تبصرہ بتاتا ہے کہ انہوں نے میری تقریر کو پوری طرح سنا اور سمجھا۔ انہیں اس میں واضح طور پر اسلام کی دعوت نظر آئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس تقریر کے ذریعہ میں حاضرین کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کر رہا ہوں۔ جس کو انہوں نے سادہ طور پر نہیں لیا، بلکہ اس کو پرچار (تبلیغ) کے ہم معنی سمجھا۔

جامعہ ریاض البنات میں اپنی تقریر ختم کر کے میں اسٹیج سے اترا تو ایک باریش بزرگ نے مجھے دو کتابیں پیش کیں۔ یہ دونوں کتابیں میری مخالفت میں لکھی گئی تھیں۔ میں نے ان کتابوں کو لیتے ہوئے کہا کہ میں ان کتابوں کو پڑھ چکا ہوں۔ یہ غیر علمی کتابیں ہیں۔ وہ اپنی تردید آپ ہیں۔ ان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

ان میں سے ایک کتاب "اسلامی فکر کیا ہے" میں ہمارے مشن کو مطعون کرتے ہوئے صاحب کتاب نے لکھا تھا کہ نعوذ باللہ، ہمارا مشن "اسلام پسندی کی رَو کو روکنے کی کوشش" ہے۔

مصنف کی کتاب اور ان کے ساتھی اس قسم کی باتوں کو "تنقیدی جائزہ" سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف سبّ وشتم ہے۔ اور اس قسم کا بے دلیل سبّ وشتم کسی بھی شخص کے خلاف کیا جا سکتا

ہے۔ مثلاً مذکورہ مصنف کی مخالفانہ تحریروں کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے دعوتی مشن کی رَو کو روکنے کی ایک ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

حیدر آباد میں میرے خطابات کی رپورٹنگ مقامی اخباروں میں ہوتی رہی، اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ انگریزی اخبار دکن کرانکل کے شمارہ ۷ فروری ۲۰۰۰ میں شائع شدہ رپورٹ کا عنوان یہ تھا:

Muslims urged to facilitate dialogue with other faiths.

اس رپورٹ کے چند جملے یہ تھے:

He described Islam as a religion with a solid historical base. Today's man relates to history and logic as never before. The religions that have their grounding in vague and unfounded references and superstitions do not have a chance to survive. If the people are allowed to make a choice on the basis of facts, Islam would win unopposed.

حیدر آباد میں وہاں کے ایک صاحب نے کہا کہ جماعت اسلامی والے آپ کی مخالفت کرتے ہیں حالانکہ اب وہ اپنے بانی کی نام نہاد سیاسی فکر کو چھوڑ چکے ہیں اور آپ ہی کے دعوتی فکر کو لے کر چل رہے ہیں۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے حیدر آباد کے روزنامہ سیاست کا شمارہ ۳ دسمبر ۱۹۹۹ مجھے دکھایا۔ اس کے پہلے صفحہ پر سنگل کالم کی فیکس سے موصول شدہ ایک خبر میں جماعت اسلامی کے موجودہ امیر کی تقریر کی رپورٹ چھپی تھی۔ اس کے مطابق جماعت کے موجودہ امیر نے ایس آئی او کے ایک تربیتی کیمپ (نئی دہلی) کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ہندستان نہ دارالحرب ہے نہ دارالکفر بلکہ یہ دارالدعوۃ ہے۔"

حیدر آباد کے جن صاحب نے مذکورہ اخبار مجھے دکھایا تھا انھوں نے کہا کہ یہ بات یقینی طور پر انہوں نے آپ سے لی ہے۔ یہ لوگ جب اپنے بانی کی فکر کو چھوڑ کر آپ ہی کی فکر کو اختیار کر چکے ہیں تو پھر وہ آپ کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو یہ ان کے اوپر آپ کا ایک فکری احسان ہے۔ ان کے بانی کی ناقابل عمل سیاسی فکر نے ان کو ایک بند گلی (impasse) میں پہنچا

دیا تھا۔ آپ نے ان کو اس بند گلی سے نکال کر عمل کی ایک کھلی شاہراہ فراہم کر دی۔

اس سوال کا جواب تو وہی لوگ دے سکتے ہیں۔ البتہ میں ایک اصولی بات کہوں گا۔ وہ یہ کہ اگر آپ کسی کے عطیہ کا اعتراف نہ کریں تو آپ نے خود اپنے کو ایک بہت بڑے گھاٹے میں مبتلا کر لیا۔

حدیث میں آیا ہے کہ: من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ (احمد، ترمذی) یعنی جو آدمی انسان کا شکر ادا نہ کرے وہ خدا کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا۔ شکر کیا ہے۔ شکر کی حقیقت قلبی اعتراف ہے۔ جس چیز کو انسانی معاملات میں اعتراف کہا جاتا ہے اسی کا نام خدائی معاملہ میں شکر ہے۔ اگر آپ کو کسی انسان سے ایک عطیہ ملے اور آپ اس کا سچا اقرار نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا سینہ جذبۂ اعتراف سے خالی ہے اور جو سینہ ایک کے معاملہ میں اعتراف سے خالی ہو وہ یقینی طور پر دوسرے کے معاملہ میں بھی اعتراف سے خالی ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شکر سب سے بڑی عبادت ہے۔ جس آدمی کے اندر شکر و اعتراف کا جذبہ نہ ہو وہ گویا اسی عبادتی حلاوت سے محروم رہ گیا جو اس دنیا میں کسی مومن کے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ تاہم شکر گہرے قلبی احساس کا نام ہے نہ کہ زبان سے کچھ الفاظ بول دینے کا۔

ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ جو لوگ الرسالہ مشن کے خلاف جھوٹا طوفان کھڑا کر رہے ہیں مجھے اس کی کوئی پریشانی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ الرسالہ مشن کا اعتراف خواہ آج نہ کیا جائے مگر انشاء اللہ مستقبل کا مورخ اس کا اعتراف کرے گا۔ وہ لکھے گا کہ الرسالہ مشن عمومی اندھیرے میں سچائی کا ایک چراغ تھا۔

ایسے وقت میں جب کہ پوری مسلم دنیا اسلامی عمل کا مطلب صرف یہ سمجھتی تھی کہ اسلامی نظام کے نام پر حکمرانوں سے ہلاکت خیز ٹکراؤ کیا جائے، اس وقت الرسالہ مشن نے یہ بتایا کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سیاسی ٹکراؤ سے اعراض کر کے پر امن تعمیر کے میدان میں کام کیا جائے۔ جب تمام مسلم ذہن صرف اس اعلان میں مشغول تھے کہ مغربی قومیں اسلام دشمن ہیں، ان سے لڑو، اس وقت الرسالہ مشن نے یہ نشاندہی کی کہ مغربی تہذیب نے دعوت کے نئے عظیم الشان مواقع

کھولے ہیں، ہمیں چاہئے کہ ہم ان مواقع کو استعمال کریں۔ فلپائن اور برما جیسے بہت سے ملکوں میں جب مسلم رہنما اپنا علیحدہ سیاسی جزیرہ بنانے کے نام پر مرکزی حکمرانوں سے خونی جنگ چھیڑے ہوئے تھے، اس وقت الرسالہ مشن نے بتایا کہ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ تقسیم کے بجائے توسیع کو اپنا نشانہ بنایا جائے۔ اسی طرح ہندستان میں جب تمام علماء اور دانشور اس انکشاف میں مشغول تھے کہ یہاں دوسرا اسپین بنایا جارہا ہے۔ الرسالہ مشن نے یہاں کے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اس ملک میں ان کے لئے ہر قسم کے بہترین ترقیاتی مواقع موجود ہیں۔ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں ظاہر ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے بارہ میں جب مسلم رہنما صرف یہ جانتے تھے کہ ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کا بے فائدہ لفظی طوفان برپا کرتے رہیں، اس وقت الرسالہ مشن نے اس نکتہ سے آگاہ کیا کہ اعراض کا اصول اختیار کرو، اور پھر فسادات اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ میں نے آپ کی تحریریں پڑھی ہیں۔ آپ الجزائر میں مسلم سالویشن فرنٹ کے مسلح جہاد کو درست نہیں سمجھتے۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ الجزائر میں اسلام پسندوں کو الکشن کے ذریعہ اقتدار تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ ایسی حالت میں وہ اور کیا کر سکتے تھے کہ اپنے مقصد کے لئے تشدد کا سہارا لیں۔

I think they are more than justified. They were denied of ballots so they opted for bullets. What's wrong with this.

میں نے کہا کہ یہ تشدد کے لئے کافی جواز نہیں۔ مسلم اداروں میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص میرٹ پر قابل انتخاب ہوتا ہے مگر ادارہ کے ذمہ دار اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر اس کو رد کر دیتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ کسی اور شخص کا تقرر کر دیتے ہیں۔ اب اگر یہ رد کیا ہوا آدمی ادارہ کے ذمہ داروں کے خلاف بندوق اٹھالے تو کیا آپ اس کو جائز قرار دیں گے۔ میں نے کہا کہ اقتدار کے حصول کو نشانہ بنا کر تحریک چلانا بذات خود ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ اور جب اقتدار نہ ملنے پر تشدد شروع کر دیا جائے تو یہ مزید اضافہ کے ساتھ غیر اسلامی فعل ہوگا۔ ان اسلام

پسندوں کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ حکمرانوں سے ٹکراؤ کو چھوڑ کر غیر سیاسی میدان میں دعوت اور تعلیم و ترقی کا کام کریں اور آپ جانتے ہیں کہ اس طرح کے مواقع الجزائر سمیت ہر ملک میں پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ تباہ کن فتنہ اسلام کی سیاسی تفسیر کا فتنہ ہے۔ اس سیاسی تفسیر نے اقتدار کو نشانہ بنا کر مسلمانوں کو تخریب کے راستہ پر ڈال دیا۔ اس سیاسی تفسیر نے موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان شاید پوری تاریخ میں اسلام کو نہیں پہنچا۔ قرآن کے مطابق، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ صالح زندگی گزارنا نشانۂ عمل ہے، اور سیاسی اقتدار کا پانا نتیجۂ عمل۔

ایک مجلس میں میں نے قرآن کی کچھ آیتوں کی تشریح کی۔ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو کر رہ گیا۔ اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر بوجھ لادے تب بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم یہ احوال ان کو سناؤ تاکہ وہ سوچیں (الاعراف ۷۶: ۱۷۵)

سبب نزول کی روایات کے مطابق، یہ آیتیں امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں اتریں۔ مگر تو سیعی مفہوم کے لحاظ سے ان آیتوں کا تعلق ہر دور سے ہے۔ ہر زمانہ کے انسانوں میں اس قسم کا کردار پایا گیا ہے جس کا ذکر قرآن کی ان آیتوں میں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کی تعمیر کا موقع ہو مگر وہ دنیا کی تعمیر میں پھنس کر رہ جائیں، وہ اس سے اوپر نہ اٹھ سکیں۔

ایک شخص کو اقتدار ملے تو اس کے لئے یہ موقع ہے کہ وہ اقتدار کے ذریعہ عدل قائم کرے۔ مگر وہ اقتدار کو صرف ذاتی بڑائی کا ذریعہ بنالے۔ ایک شخص کو مال ملے۔ مگر وہ اپنے مال کو کارِ خیر میں استعمال کرنے کے بجائے اس کو ذاتی نمائش میں استعمال کرنے لگے۔ ایک شخص کو کسی

ادارہ کا ذمہ دار بنایا جائے، اس طرح اس کو یہ موقع ملے کہ وہ اس ادارہ کو بنیاد بنا کر دین و ملت کی خدمت کرے۔ مگر وہ اس ادارہ کو صرف اپنے ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ بنالے۔

اس قسم کا ہر کردار امیہ بن ابی الصلت کی مانند ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے رفعت کے بدلے پستی کا انتخاب کیا۔ اس کے لئے خدا کو راضی کرنے کا موقع تھا، مگر وہ صرف اپنی ذات کی پرستش میں لگا رہا۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں آج بھی بے قیمت ہیں۔ اور آخرت کے دن بھی وہ خدا کی نظر میں بے قیمت قرار پائیں گے۔ یہاں کے ایک عالم نے کہا کہ فقہ کے اختلافات پر آپ کی کتاب (تجدید دین) میں نے پڑھی۔ آپ نے اس میں فقہی اختلافات کی نہایت عمدہ توجیہہ کی ہے۔ اب آپ یہ بتایئے کہ فقہ میں عبادات کی جو درجہ بندی کی گئی ہے ــــ فرض، واجب، سنت، سنت موکدہ، نفل وغیرہ، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے درست طور پر لکھا ہے کہ یہ درجہ بندی یا یہ تقسیمات بعد کے فقہاء نے کی ہیں، وہ حدیث میں موجود نہیں (حجۃ اللہ البالغۃ)۔ میں اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ امورِ تعبدی میں اجتہاد نہیں ہے۔ اس لئے ان تقسیمات کی وہ اہمیت نہیں ہو سکتی جو عام طور پر لوگوں نے انہیں دے رکھی ہے۔

مزید یہ کہ اس درجہ بندی کا ایک نقصان بھی ہے۔ قرآن کے مطابق، عبادت کی اصل خشوع ہے۔ اس اعتبار سے عبادتی اعمال کی درجہ بندی کیفیت عبادت کے لحاظ سے ہونا چاہئے نہ کہ اشکالِ عبادت کے لحاظ سے، جیسا کہ ان تقسیمات میں کیا گیا ہے۔

میں نے حیدر آباد میں ایک صاحب کی تقریر میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ دور اول میں اسلام کی جو دعوت چلائی گئی اس کا ذریعہ کتابوں کو پڑھنا پڑھانا نہ تھا بلکہ اخلاق تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بات قرآن کے خلاف بھی ہے اور واقعہ کے خلاف بھی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اقرء باسم ربك الذی خلق .....علم بالقلم۔

قرآن خود ایک کتاب ہے۔ آج کل کی زبان میں گویا کہ وہ ایک پیریاڈیکل (Periodical) تھا

جو ۲۳ سال کے دوران میں وقفہ وقفہ سے اترتا رہا۔ دور اول کے مسلمان اس حصۂ قرآن کو فوراً پڑھ کر یاد کر لیتے اور اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔ وہ روزانہ غیر مسلموں کی مجالس میں جاکر انہیں قرآن سناتے۔ مقرر نے غالباً یہ دیکھا کہ اس زمانہ میں پرنٹنگ پریس نہ تھا۔ موجودہ قسم کی مجلد کتابیں اس وقت نہیں پائی جاتی تھیں۔ پھر مطالعہ کے ذریعہ کیسے اسلام پھیلایا جاتا۔ حالانکہ مکہ اور مدینہ میں دعوت کا جو طریقہ چلایا گیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مطالعۂ کتاب ہی کی حیثیت رکھتا تھا۔ صحابہ اپنے اپنے ماحول میں قرآن کی بنیاد پر گویا اسٹڈی سرکل چلا رہے تھے۔ خود قرآن کے الفاظ میں: تعلیم بالقلم (بالفاظِ دیگر تعلیم بالکتاب) دعوت کا ذریعہ ہے نہ کہ تعلیم بالاخلاق۔ اخلاق ایک شخصی عمل ہے جس کا محرک تقویٰ ہے نہ کہ دعوت۔

ریاست حیدر آباد اپنے ابتدائی دور میں مغلوں کے ماتحت رہی۔ ہندستان میں جب برٹش دور آیا تو انھوں نے برٹش ماتحتی کو قبول کر لیا۔ یہ گویا سیاسی ٹکراؤ کو avoid کر کے اپنی موجود حیثیت کو برقرار رکھنا تھا۔ حیدر آباد کے مسلم حکمرانوں کی یہ پالیسی ان کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ اس طرح وہ کئی سو سال تک شاندار طور پر اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب رہے۔ ۱۹۴۷ میں تقریباً اسی نوعیت کا معاملہ ان کے لئے تیسری بار پیش آیا۔ اب ان کے لئے موقع تھا کہ وہ نئی دہلی کی سیاسی ماتحتی کو قبول کر کے بدستور اپنے ریاستی وجود کو باقی رکھیں۔ مگر کچھ پرجوش اور بے خبر مسلم لیڈروں کی غیر حقیقت پسندانہ سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدر آباد نے اپنی سابقہ حیثیت کھودی۔ وہ خود اپنے ہی کئی سو سالہ تجربہ سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ فرد کا معاملہ ہو یا حکومت کا معاملہ، اس دنیا میں ہر ایک کے لئے بہترین پالیسی یہ ہے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لے۔ وہ اپنے وجود سے باہر پائی جانے والی ناقابلِ تغیر حقیقتوں کو جانے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا جو راستہ ہے وہ زیادہ پانے کے نام پر تھوڑے کو بھی کھو دینا ہے۔ حاکمانہ حیثیت کو حاصل کرنے کے نام پر آخرکار محکومانہ زندگی پر راضی ہونا ہے۔

حیدر آباد میں بہت سے تاریخی آثار ہیں۔ان میں سے ایک سالار جنگ میوزیم ہے۔اس میوزیم میں ۴۰۰۰۰ قیمتی نوادر اکٹھا کئے گئے ہیں۔یہ میوزیم اپنی خصوصیات کی بنا پر عالمی شہرت رکھتا ہے۔اس کے بارے میں انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں یہ الفاظ درج ہیں ـــــ نوادرات کا یہ ذخیرہ پوری مشرقی دنیا میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ شاید پوری دنیا میں:

The Collection is unique in the East and perhaps in the world.

حیدر آباد کا ایک سبق آموز واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۸ میں پولیس ایکشن کے بعد یہاں کے مسلمانوں نے اچانک پایا کہ وہ یہاں بالکل بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔ لیکن جلد ہی بعد لوگوں نے دیکھا کہ یہاں کے مسلمان بڑی تعداد میں باہر کے دولت مند ملکوں میں گئے اور وہاں انھوں نے پہلے سے زیادہ ترقیاں حاصل کر لیں۔اس کا راز کیا تھا۔میں نے اس سلسلہ میں جو کچھ معلوم کیا اس کے مطابق اس کا راز یہ تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے نظام کی حکومت نے یہاں تعلیم کو بہت ترقی دی۔ حتی کہ یہاں کی بیشتر آبادی تعلیم یافتہ ہو گئی۔

نظام کی حکومت نے ۱۹۱۶ میں پرائمری ایجوکیشن کی مکمل ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔اس پالیسی کے تحت پرائمری تعلیم ہر فرد کے لئے مفت اور لازمی قرار دے دی گئی۔ ۱۹۴۷ کے اعداد و شمار کے مطابق حیدر آباد شہر میں ۴۰۰ پرائمری اسکول تھے۔اسکولی عمر کے تمام لڑکے اور ۹۰ فیصد لڑکیاں ان اداروں میں تعلیم پا رہی تھیں۔اس کے علاوہ ریاستی حکومت کی مدد سے کثیر تعداد میں شہر میں مڈل اسکول اور سکنڈری اسکول قائم ہو گئے۔اسی طرح کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے بھی لوگوں کو ہر قسم کے مواقع فراہم کئے گئے۔

تعلیمی اداروں کی اس کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ تک حیدر آباد کے تقریباً تمام مرد و عورت کم و بیش تعلیم یافتہ بن چکے تھے۔اس تعلیمی لیاقت نے یہاں کے لوگوں کو نیا حوصلہ دیا۔وہ بڑی تعداد میں باہر کے ملکوں میں چلے گئے۔اور پھر وہاں اپنی تعلیمی لیاقت کی بنیاد پر نیا ترقیاتی سفر شروع کر دیا۔

آج کے حیدر آباد میں آپ جدھر بھی جائیں، آپ کو یہاں کے مسلمانوں کی نئی ترقیوں

کے مناظر دکھائی دیں گے۔ قدیم حیدر آباد میں اگر "چار مینار" یہاں کی ترقی کی علامت تھا تو اب شاید چار سو سے زیادہ مینار یہاں کی ترقیوں کی علامت بنے ہوئے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس دنیا میں کوئی بھی حادثہ یا کوئی بھی سازش کسی قوم کا راستہ روکنے والی نہیں۔ خدا کی اس دنیا میں مواقع اور امکانات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا یکسر خاتمہ کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ یہاں اگر ایک امکان کو ختم کیا جائے تو اس کے بعد ایک سو مزید امکان ابھر کر سامنے آجائیں گے۔

حیوانات کی دنیا میں ایک امیبا (amoeba) ختم ہو کر دو امیبا پیدا کر دیتا ہے۔ انسان کی دنیا میں یہی امکان مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ یہ نظام خود فطرت کے اٹل قانون کے تحت قائم ہے۔ اور بلاشبہہ کوئی بھی اتنا طاقتور نہیں جو فطرت کے قانون کو بدل سکے۔

مولانا مصلح الدین قاسمی حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ انھوں نے روزنامہ منصف کے دو شمارے (۵ مارچ، ۲ اپریل ۱۹۹۹) دیئے۔ ان میں ان کا ایک مضمون دو قسطوں میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا: "مولانا وحید الدین خاں کے خلاف اعتراضات، کتنی حقیقت، کتنا فسانہ"۔

اپنے اس تفصیلی مضمون میں مولانا مصلح الدین صاحب نے صرف یہ کیا تھا کہ میرے معترضین نے میری جن عبارتوں کی قطع و برید کر کے ان پر اعتراضات وارد کئے ہیں۔ وہ عبارتیں انھوں نے اصل کتاب سے لے کر پوری پوری نقل کر دیں۔ یہ طریقہ اپنے آپ اعتراضات کا جواب بن گیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ یہ غیر ذمہ دار معترضین میری عبارتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اس کو خود ساختہ انداز میں پیش کر رہے تھے اور اس طرح لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال رہے تھے۔ مولانا مصلح الدین صاحب نے بتایا کہ ان کے اس مضمون کی اشاعت کے بعد لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور وہ خود معترضین کو غلط سمجھنے لگے جنھوں نے اصل عبارت میں مسخ (distortion) کے ذریعہ اپنا خود ساختہ اعتراض نکالا تھا جو کہ اصل عبارت میں سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

قیام حیدر آباد کے دوران بار بار شہر کی مختلف علاقوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ ہر طرف اقتصادی سرگرمیاں دکھائی دیں۔ ایک صاحب سے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں پیسہ کمانے کے

جو نئے نئے مواقع کھلے ہیں ان کے بعد کسی کو ہمارے خلاف دشمنی کرنے کی فرصت نہیں۔ ہر آدمی اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اگر آپ اس کو نہ چھیڑیں تو وہ کبھی آپ کے لئے خطرہ نہیں بنے گا۔ موجودہ زمانہ لوگوں کے لئے شدید معاشی مصروفیت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں کے شر سے بچنے کی سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ انہیں اپنے اقتصادی کاموں میں مشغول رہنے دیا جائے۔

۶ فروری کو دوسرا خطاب منالی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ یہ شام کو مغرب کی نماز کے بعد تھا۔ اس کا موضوع تھا: اسلام کی دعوت ۲۱ویں صدی میں۔

میں نے اپنی مفصل تقریر میں کہا کہ دور جدید اپنے امکانات کے اعتبار سے دور اسلام ہے۔ زمانہ نے فیصلہ کی جو نئی بنیاد فراہم کی ہے وہ عین ہمارے حق میں ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ دعوت کے جدید امکانات کو بتایا۔

۷ فروری کی شام کو منالی گیسٹ ہاؤس میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اکثر اخبارات کے نمائندے اس میں موجود تھے۔ زیادہ تر سوالات مسلم مسائل کے بارے میں کئے گئے۔ جن کا جواب میں نے قرآن وسنت کی روشنی میں دیا۔

ایک اخبار نویس نے کہا کہ آپ اکثر مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ آخر یہ صبر کب تک۔ میں نے کہا کہ یہ سوال اتنا ہی غیر مناسب ہے جتنا کہ یہ سوال کہ نماز کب تک یا روزہ کب تک۔ ظاہر ہے کہ نماز اور روزہ خدا کی طرف سے انسان کے اوپر عبادتی فریضہ ہے، اس لئے اس میں "کب تک" کا سوال نہیں۔ جب تک آپ اس دنیا میں ہیں اس وقت تک آپ کو نماز و روزہ کا فریضہ انجام دینا ہے۔

یہی معاملہ صبر کا بھی ہے۔ صبر کوئی مجبورانہ روش نہیں۔ وہ خدا کی ایک عبادت ہے۔ بلکہ صبر سب سے بڑی عبادت ہے۔ کیوں کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والے بلا حساب اجر پائیں گے۔ (الزمر ۳۹) ایسی حالت میں ہم کو زیادہ سے زیادہ صبر کرنا ہے تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ انعام پائیں۔

اصل یہ ہے کہ خدا کو یہ مطلوب ہے کہ انسان فتنوں سے بھری اس دنیا میں مثبت نفسیات

کے ساتھ رہے، وہ کبھی منفی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ جو سینہ منفی نفسیات سے خالی ہو اسی سینہ کے اندر اعلیٰ ربانی کیفیات پرورش پاتی ہیں۔ ایسا ہی شخص عبادت اور اخلاق کے معاملہ میں اعلیٰ درجہ کا عمل کر سکتا ہے۔ ایسا ہی شخص وہ ربانی انسان بنتا ہے جس کو جنت میں جگہ دی جائے۔ صبر کا لمحہ ہمارے لئے رحمت خداوندی کے حصول کا لمحہ ہے، وہ کوئی نامطلوب چیز نہیں۔

حبیب بھائی حیدر آباد کے ایک تاجر ہیں انھوں نے ایک ملاقات میں کہا کہ "اسلامی حکومت قائم کرو" یہ سراسر غیر اسلامی بات ہے۔ اصل کام اسلام کے نظریہ کو قائم کرنا ہے نہ کہ کسی حکومت کو قائم کرنا۔ سارا فساد اس لئے ہے کہ لوگوں نے مکمل دین کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ ہمارا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ حالانکہ اصل مقصد اسلامی نظریہ کی صداقت کو قائم کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے بہت صحیح بات کہی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اسلام آج کل تشدد کے ہم معنی بن گیا ہے۔ جب کہ اسلام سراسر رحمت اور سلامتی کا دین ہے۔

حیدر آباد میں میرا قیام حبیب بھائی کے مکان پر تھا۔ پروگرام میں شرکت کے لئے میں ان کے گھر سے روانہ ہوا۔ گاڑی حیدر آباد کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک مقام پر رکی۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک پرشکوہ چھ منزلہ عمارت تکمیل کے آخری مرحلہ میں تھی۔ یہ جامعہ ریاض البنات کی نئی عمارت تھی جو مولانا سید اکبر الدین قاسمی کی کوششوں سے بن رہی ہے۔

۱۹۹۷ سے پہلے اس جگہ اس قسم کی کوئی عمارت موجود نہ تھی۔ یہ صرف حال میں بن کر تیار ہوئی ہے۔ اسی عمارت کے کشادہ ہال میں وہ دوروزہ پروگرام ہوا جس میں شرکت کے لئے میں یہاں آیا تھا۔

جامعہ ریاض البنات کی یہ شاندار ملٹی اسٹوری بلڈنگ گویا نئے حیدر آباد کی ایک علامت ہے۔ آج کے حیدر آباد کے مسلمانوں میں مختلف قسم کی تعمیری سرگرمیاں بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہیں۔ افراد اور جماعتیں بہت بڑے پیمانہ پر ترقی یافتہ حیدر آباد کی تعمیر میں مشغول ہیں۔

جامعہ ریاض البنات کو دیکھ کر میرے ذہن میں حیدر آباد کی سو سال کی تاریخ گھومنے لگی۔

حیدر آباد کے مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مدت میں ان کی ساری کوششیں حیدر آباد کی مسلم ریاست کے ساتھ وابستہ رہیں۔ تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ بس یہ لکھنے اور بولنے میں مشغول تھے کہ حیدر آباد کی مسلم ریاست باقی رہے۔ ان کے نزدیک اسی ریاست کے ساتھ ان کے دینی اور ملی وجود کا بقا منحصر تھا، حتی کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے نتیجہ میں جب تاریخ نے حیدر آباد کو انڈین یونین کا ایک لازمی جغرافی حصہ بنادیا، اس وقت بھی یہاں کے مسلم رہنما ناقابلِ فہم طور پر اسی سوچ میں مبتلا رہے کہ حیدر آباد کسی نہ کسی طرح ایک مسلم سیاسی جزیرہ کے طور پر باقی رہے۔

لیکن اگر حقیقی حالات کو دیکھا جائے تو مسلم لیڈروں کی یہ کوشش اتنی زیادہ بے معنی معلوم ہوگی کہ اس کو کوئی عنوان دینا ہی ناممکن نظر آئے گا۔

حیدر آباد کی مسلم ریاست کے زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کا حال کیا تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کی سوچ بس یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ ریاست کے اندر کوئی ملازمت حاصل کرلیں۔ اس زمانہ میں یہاں کے تمام لوگ صرف ریاست کی اصطلاح میں سوچتے تھے۔ ریاست کے تقریباً تمام مسلمان بس ریاستی ملازمین کا ایک گروہ بن کر رہ گئے۔ ۱۹۴۸ میں جب حیدر آباد میں پولیس ایکشن ہوا اور ریاست کا خاتمہ ہوگیا تو یہاں کے مسلمانوں نے سمجھا کہ ان کے وجودِ ملی کا ستون گر گیا اور اب یہاں مسلمانوں کے لئے کسی زندگی اور ترقی کا کوئی امکان نہیں۔

لیکن آج کے حیدر آباد کا سروے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حیدر آباد کے مسلمان آج ۱۹۴۷ سے پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر حالت میں ہیں، معاشی اعتبار سے بھی اور ملی اور دینی اعتبار سے بھی۔

آج حیدر آباد کے مسلمانوں کے پاس ہر قسم کے ترقیاتی سامان وافر مقدار میں موجود ہیں۔ کار اور ٹیلی فون، پختہ مکانات، بچوں کی اعلیٰ تعلیم، سامان راحت، غرض اقتصادی ترقی کے تمام اسباب یہاں ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مسجدیں اور مدرسے اور اسلامی ادارے

بہت بڑی تعداد میں سارے حیدر آباد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ریاستی دور کے مقابلہ میں آج کے مسلمان کیوں زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ اس کے سبب پر غور کیجئے تو ایک نہایت اہم حقیقت سامنے آئے گی۔ اصل یہ ہے کہ ریاست کے دور میں مسلمانوں کا ذہن تمام تر ریاست کے اوپر اٹکا ہوا تھا۔ اس ذہنی اٹکاؤ کی بنا پر ان کی فکری صلاحیتیں دبی ہوئی تھیں۔ ان کی خداداد صلاحیتیں ابھرنے نہیں پاتی تھیں۔ جب ریاست ختم ہو گئی تو وہ ایک شاک سے دو چار ہوئے۔ ریاست کا خاتمہ ان کے لئے ایک شاک ٹریٹمینٹ (Shock Treatment) کے ہم معنی تھا۔

اب ہر آدمی دوڑ بھاگ کرنے لگا۔ کچھ لوگ حیدر آباد سے نکل کر باہر کے ملکوں میں چلے گئے اور وہاں تعلیمی اور اقتصادی جدوجہد شروع کر دی۔ بقیہ لوگ حیدر آباد کے اندر کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح ان کی وہ تمام صلاحیتیں جاگ اٹھیں جو ریاست پر انحصار کی وجہ سے ابھی تک سوئی ہوئی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست پر انحصار نے یہاں کے مسلمانوں کو زیرو بنا رکھا تھا۔ مگر جب ریاست کا سہارا ختم ہوا اور انھیں اپنے آپ پر اعتماد کرنا پڑا تو اس کے بعد ایک ایک مسلمان ہیرو بن گیا۔

یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں انحصار (dependence) سے صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور خود اعتمادی سے صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ غیر پر اعتماد آدمی کو ترقی سے روک دیتا ہے اور اپنے آپ پر اعتماد اس کے لئے ترقی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

حیدر آباد کے اس اجتماع میں باہر سے بھی کئی لوگ آئے تھے۔ یہ سب الرسالہ کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ مثلاً بھوپال سے ڈاکٹر حمید اللہ ندوی، جناب بلال الدین صاحب۔ اسی طرح ناندیڑ سے جناب کشن راؤ پاٹل وغیرہ۔

۱۹۷۶ میں جب ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ساری دنیا میں میں اکیلا ہی اس مشن کے ساتھ ہوں۔ اس وقت یہ ایک اکیلے انسان کا سفر معلوم ہوتا تھا جو اس نے

تاریکیوں کی لامتناہی فضا میں شروع کیا تھا۔ ہر آدمی اس کو دیوانگی کا ایک اقدام سمجھتا تھا۔ اس وقت غالباً کوئی بھی شخص نہ تھا جو یہ سمجھتا کہ الرسالہ چلے گا اور وہ ایک عالمی مشن کی صورت اختیار کرے گا۔ مگر آج خدا کے فضل سے نہ صرف ہندستان میں بلکہ تقریباً ساری دنیا میں اس سے وابستہ افراد موجود ہیں اور اب یہ مشن خدا کے فضل سے انٹرنیٹ پر بھی آچکا ہے۔

مولانا اکبر الدین قاسمی صاحب نے اپنی ایک تقریر میں درست طور پر کہا کہ الرسالہ مشن کو پھیلانے میں اس کے دوستوں سے زیادہ اس کے مخالفین کا ہاتھ شامل رہا ہے۔ لوگوں نے اتنی زیادہ اس کی مخالفتیں کیں اور دنیا بھر میں اس کے خلاف اتنا زیادہ پروپیگنڈا کیا کہ جو لوگ الرسالہ کا نام بھی نہ جانتے تھے وہ بھی اس سے واقف ہو گئے۔ مخالفین کے ذریعہ متعارف ہونے والے ان لوگوں میں ہزاروں آدمیوں کو صرف ان مخالفین نے الرسالہ کا قاری اور حامی بنا دیا۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کی مخالفتوں کے بعد الرسالہ کو پڑھنا شروع کیا اور پھر وہ ہمارے دل کی آواز بن گیا۔

حیدر آباد میں تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک مجلس میں میں نے پوچھا کہ آپ میں سے کوئی صاحب یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کو ایک ایسی چیز کی معرفت ہوئی جو اسلام کی پوری تاریخ میں کسی کو نہیں ہوئی۔ میرا یہ سوال لوگوں کو عجیب معلوم ہوا۔ میں نے کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے (لا تنقضی عجائبہ)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دور میں لوگ قرآن میں نئے نئے حقائق دریافت کرتے رہیں گے۔

پھر میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو لوگ ایمان لائے ان کو یہ ایمان درجۂ معرفت میں ملا تھا، اسی قسم کا ایمان بعد والوں سے بھی مطلوب ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا (البقرة ۱۳۷)۔ معرفت یا ڈسکوری کے درجہ میں ایمان کو پانا بلاشبہہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ خدا کی رحمتِ عام سے یہ بعید ہے کہ وہ امت کے ابتدائی لوگوں کو تو اعلیٰ درجہ کا ایمان دے اور بعد والوں کے لئے صرف کم تر درجہ کا ایمان

مقدر کرے۔ جب کہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مثل امتی مثل المطر لا یدری اولہ خیر أو آخرہ (مسند احمد ۳/ ۱۴۳) یعنی میری امت کی مثال بارش جیسی ہے۔ نہیں معلوم کہ اس کا پہلا حصہ زیادہ بہتر ہوگا یا اس کا آخری حصہ۔

حیدر آباد کے اس قیام کے دوران جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک ڈاکٹر عبدالرشید صاحب تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شکر کی بیماری، دل کی بیماری اور بلڈ پریشر وغیرہ اکثر ذہنی ٹنشن سے پیدا ہوتی ہیں۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ میں مسلسل طور پر سخت قسم کے ذہنی ٹنشن میں رہتا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ میری یہ کیفیت سپر ٹنشن تک پہنچ چکی ہے۔ بلکہ میرا ذاتی احساس تو کبھی یہ ہوتا ہے کہ شاید کوئی بھی دوسرا شخص اتنے شدید ذہنی ٹنشن میں نہ جیتا ہوگا۔ اس کے باوجود خدا کے فضل سے میرا بلڈ پریشر بالکل نارمل ہے۔ شکر کی بیماری یا دل کی بیماری بھی مجھ کو نہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کے دل کو یہ اطمینان حاصل ہے کہ آپ نے سچائی کو پایا ہے۔ آپ کا ذہنی تناؤ اور ٹنشن صرف اوپری سطح کا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قلب کی گہرائیوں میں آپ کے اندر حق پر ہونے کا سکون اور اطمینان موجود ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ اور یہی اطمینانِ قلب آپ کی ظاہری جسمانی صحت کا راز ہے۔

جناب محمد حسین صاحب (۵۲ سال) سے مغل پورہ میں ملاقات ہوئی۔ آج کل انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح دعوت کے میدان میں وقف کر دیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں ۱۹۹۳ سے برابر الرسالہ ۵ عدد ہر ماہ منگاتا ہوں۔ اور اس کو خاص طور سے علماء کے درمیان پھیلاتا ہوں۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ماشاء اللہ الرسالہ کے ذریعہ لوگوں کو بہت فائدہ ہو رہا ہے اور لوگوں کے خیالات وسیع ہو رہے ہیں۔ پڑھنے والوں کا مشترک احساس یہ ہے کہ الرسالہ میں اعراض کا قرآنی اصول، جس کی بار بار تشریح کی جاتی ہے، بے حد اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے لوگ جو آپ کے معترض تھے الحمد للہ میں نے ان کو معترف بنا دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ الرسالہ میں

ہم کو غیر مسلموں میں کام کرنے کے لئے بہترین مواد ملتا ہے۔

حبیب بھائی کا ایک فارم کیرالا میں ہے۔ ان کے صاحبزادہ محمد احمد صاحب اس کا انتظام دیکھتے ہیں۔ محمد احمد صاحب نے بتایا کہ وہ کار کے ذریعہ سفر کر کے وہاں جاتے ہیں۔ یہ مسلسل ۲۴ گھنٹہ کا سفر ہوتا ہے۔ مگر وہ رکے بغیر سفر کر کے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جب آدمی کے سامنے ایک متعین نشانہ ہو تو وہ ہیرو بن جاتا ہے۔ کوئی معلوم نشانہ نہ ہو تو آدمی مسلسل اتنا لمبا سفر نہ کر سکے۔

حیدرآباد میں قیام کے دوران ہم لوگ مدرسہ ریاض البنات (اندرون تالاب کہنہ) گئے۔ یہاں مولانا سید اکبر الدین قاسمی کے بچوں کا قرآن شروع کرانے کی تقریب میں شرکت کی۔

کشن جے ونت راؤ پاٹل (ناندیڑ) اس پروگرام میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد میں دعوت وتربیت کے عنوان سے جو پروگرام ہوا اس میں میں شریک تھا۔ انہوں نے اپنا تاثر ایک صاحب سے بتاتے ہوئے کہا کہ ـــــ مولانا نے جو بات کہی وہ اس بارے میں تھی کہ قرآن کا مطلوب انسان کون ہے اور یہ کہ ایسا انسان کیوں کر بنتا ہے۔ یہ بات انہوں نے بہت ہی اچھے ڈھنگ سے پیش کی۔ مولانا کا جو سمجھانے کا طریقہ ہے اس سے ہر انسان کی سمجھ میں بات آ جاتی ہے۔ مولانا کی تحریک انسانوں کی بھلائی کی ہے۔ دیگر علماء کی سرگرمی مسلمانوں کے لئے ہوتی ہے اور مولانا کی سرگرمی انسانوں کے لئے ہے۔ یہی بات مجھے ان سے قریب لائی ہے"۔

۷ فروری کو ہم لوگ شہر سے روانہ ہو کر اپل پہنچے۔ یہاں ہماری گاڑی ایک زیر تعمیر بلڈنگ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ چند سال پہلے جب میں آیا تھا تو یہاں ایک صحرائی ماحول تھا۔ بلا تشبیہ، گویا کہ یہ مقام ملت کے اجڑے ہوئے چمن کی ایک علامت بنا ہوا تھا۔ آج یہاں ایک عظیم اور خوبصورت عمارت ابھرتی ہوئی دکھائی دی، ٹھیک ویسے ہی جیسے پانی کے اندر سے کنول کا پھول برآمد ہوتا ہے۔ یہ شاندار عمارت جامعہ ریاض الاسلام کی تھی جو مولانا سید اکبر الدین قاسمی اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے وجود میں آئی ہے۔ اور گویا کہ وہ نئے دور میں احیاء ملت کی

ایک پر امید علامت ہے۔

گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ یہاں پانی کا کیسا انتظام ہے۔ جامعہ کے ذمہ داروں نے بتایا کہ ہم نے بورنگ کر کے یہاں پانی نکالا ہے۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب بورنگ شروع کی گئی تو معلوم ہوا کہ نیچے سب پتھر ہی پتھر ہے۔ نیچے پچاس فٹ تک یہی حال تھا۔ بورنگ کرنے والے یہ دیکھ کر مایوس ہو گئے۔ مولانا سید اکبر الدین صاحب نے لا تقنطوا من رحمة الله کے اصول پر کہا کہ آپ لوگ بورنگ جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ جب وہ لوگ ساٹھ فٹ تک پہنچے تو صاف شفاف پانی کا فوارہ ابل پڑا۔ اب یہاں اتنا زیادہ پانی نکلتا ہے کہ وہ نہ صرف مدرسہ والوں کی ضرورت کے لئے کافی ہے بلکہ آس پاس کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس جامعہ ریاض الاسلام کی زیر تعمیر عمارت کے سامنے ایک وسیع اور شاندار گیٹ بن رہا ہے۔ میں نے تجویز کیا کہ اس گیٹ کا نام زمزم گیٹ رکھا جائے۔ میں نے کہا کہ "زم زم" ایک علامتی نام ہے جو یاد دلاتا ہے کہ کس طرح ایک صحرائی دنیا میں اسلام کا ایک شاندار باغ اگا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں کے اس صحرا میں بھی اسلام کا ایک باغ اگے گا جو اسلام کی روشنی سے آج کی دنیا کو منور کرے گا۔

اس کے بعد ہم لوگ مدرسہ تحفیظ القرآن پہنچے۔ یہاں کچھ دیر قیام رہا۔ اور بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر میر محمود علی خالد (پیدائش ۱۹۴۲) تھے وہ "الرسالہ" کے ایک پرانے قاری ہیں اور "الرسالہ" کے نقطۂ نظر سے پورا اتفاق رکھتے ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ الرسالہ مشن کے بارے میں آپ اپنا تاثر بتائیے۔ انھوں نے جواب دیا "آج سارے لوگ الرسالہ کی بات تو مانتے ہیں مگر وہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ میں نے دوبارہ پوچھا، اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ذہنی طور پر اب تمام لوگ اس کو صحیح مانتے ہیں لیکن ماحول کے خوف سے اس کے اظہار کی ہمت نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ اظہار نہ کرنے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس کو غلط سمجھتے ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے

اندر اعتراف حق کی جرأت نہیں۔

۷ فروری کی شام کو ہمارا قافلہ حیدر آباد سے چل کر محبوب نگر پہنچا۔ یہاں دینی تعلیم سے منسلک علماء اور دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور دیر تک علمی اور دینی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں محبوب نگر میں پڑھی گئیں۔

محبوب نگر جاتے ہوئے ہم چند ساتھی ایک گاڑی میں سوار تھے۔ ہر ایک اپنی زندگی کے انوکھے تجربات بتا رہا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے کہا کہ میں نے ایک نظم سنی تھی جس کا ایک مصرعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ تھا: لمحوں میں صدیاں جی آیا۔ حبیب بھائی نے کہا کہ میں ایک مجلس میں شریک ہوا۔ وہاں ایک شاعر نے ایک نظم سنائی اس کا ایک مصرعہ یہ تھا: میں نے جس کو جیون سمجھا وہ تو بس ایک پل نکلا۔ مولانا سید اکبر الدین قاسمی صاحب نے بتایا کہ میں ایک بس میں سفر کر رہا تھا۔ اس میں کنڈکٹر کی سیٹ پر یہ بامعنی شعر لکھا ہوا تھا:

اک تبسم ہزار شکووں کا کتنا پیارا جواب ہوتا ہے

محبوب نگر میں سب سے پہلے ہمارا قیام محمد عبد القادر صاحب کے مکان پر تھا۔ وہیں سب کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہم لوگوں کو جسمانی غذا سے زیادہ روحانی غذا کی فکر کرنی چاہئے۔ آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اس لئے کماتے ہیں کہ دنیا کے لذیذ کھانوں کو اپنے دستر خوان پر جمع کر سکیں اور اس کو کھا کر اور کھلا کر خوش ہوں۔

خدا نے اپنی دنیا میں دو قسم کی غذائیں پیدا کی ہیں ـــــ جسمانی غذا اور روحانی غذا۔ عام لوگ صرف جسمانی غذا کی لذتوں سے آشنا ہیں۔ اس سے ہزاروں گنا بڑی لذت وہ ہے جو ٹھیک اسی دنیا میں ہمارے خدا نے ہمارے لئے فراہم کی ہے۔ کم تر غذا پر ٹوٹنا اور برتر غذا کو نظر انداز کرنا، میرے نزدیک خدا کی تخلیق کی ناقدری ہے۔ جسمانی غذا صرف ہمارے مادی وجود کے بقا کے لئے ہے جب کہ روحانی غذا ہماری ابدی حیات کا سرمایہ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہم کو کھانے کا شوق نہیں بلکہ کھلانے کا شوق ہے۔ میں نے جواب

دیا کہ یہ شوق اچھا ہے مگر آپ کو چاہئے کہ مادی کھانا کھلانے کے بجائے لوگوں کو روحانی کھانا کھلائیں۔ مثلاً لوگوں کو اسلام کا لٹریچر پڑھانا۔ لوگوں تک اسلام کا بابرکت پیغام پہنچانا، لوگوں کو بے شعوری کے اندھیرے سے نکال کر شعور کے اجالے میں لانا، وغیرہ۔

محبوب نگر میں جناب عبدالحکیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پندرہ سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے مطالعہ سے یہ سمجھا ہے کہ اس دنیا کا ہر معاملہ پر امن کوشش یا بات چیت کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے۔ تشدد کا طریقہ صرف مسائل میں اضافہ کرتا ہے، وہ مسائل کو حل نہیں کرتا۔ مجھے الرسالہ کے اس نظریہ سے پورا اتفاق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف اس ایک اصول کو پکڑ لیں تو ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں۔ ترقی کی دوڑ میں وہ بھی دوسری قوموں کی طرح آگے بڑھ جائیں۔

۷ فروری کی شام کو محبوب نگر میں الفرقان ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا۔ الفرقان ایجوکیشنل سوسائٹی یہاں کے کچھ تعمیر پسند لوگوں نے قائم کی ہے۔ میں نے کہا کہ ایجوکیشن بلاشبہہ ایک بنیادی کام ہے۔ مسلمانوں کو اس میدان میں زیادہ سے زیادہ سرگرم ہونا چاہئے۔ میں نے مزید کہا کہ ایجوکیشنل کام کے دو شعبے ہیں۔ ایک ہے لوگوں کی تعلیم کا انتظام کرنا۔ اور دوسرا کام ہے لوگوں کے اندر صحیح فکر و شعور پیدا کرنا۔ اور یہ دونوں ہی کام یکساں طور پر اہم ہیں۔

اس اجتماع میں محبوب نگر کے تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس میں مجھے خطاب کرنے کا موقعہ ملا۔ اس خطاب کا موضوع تھا: اسلام دور جدید میں۔ اس موضوع کی نسبت سے ایک تفصیلی تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ نئے دور کا مطلب ہے بدلا ہوا دور۔ ہر بار جب حالات بدلتے ہیں تو وہ کسی نظریہ کے لئے ایک امتحان (ٹسٹ) ہوتا ہے۔ یعنی یہ سوال کے بدلے ہوئے حالات اس کی حقانیت کی تصدیق کرتے ہیں یا تردید۔

میں نے مختلف مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ اسلام اس ٹسٹ پر مکمل طور پر پورا اترتا ہے۔ نیا بدلا ہوا دور اسلام کی صداقت کو از سر نو ثابت شدہ بنا رہا ہے۔ اس بات کو مختلف علمی اور تاریخی مثالوں کے ذریعہ واضح کیا۔

محبوب نگر میں پہلے جامعہ سراج العلوم کے نام سے لڑکوں کی دینی تعلیم کا ایک مدرسہ تھا۔ یہ خدا کے فضل سے کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اب اس کے ذمہ دار مولانا امیر اللہ خاں قاسمی اور ان کے ساتھیوں کی کوشش سے لڑکیوں کی دینی تعلیم کا بھی ایک بڑا ادارہ قائم ہو گیا ہے جس کا نام جامعہ سراج البنات ہے۔ اس کی شاندار عمارت میں نے دیکھی۔ میں نے کہا کہ آج کل مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے مدرسے جگہ جگہ قائم ہو رہے ہیں۔ یہ ملت کے لئے نئے روشن مستقبل کی علامت ہے۔ محبوب نگر کے اس جامعہ سراج البنات کے لئے جو زمین خریدی گئی وہ ایک ہندو کی تھی۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ یہ زمین لڑکیوں کی تعلیم کے لئے خریدی جا رہی ہے تو اس ہندو نے مزید تین سو گز زمین بلا قیمت دے دی۔ اس نے کہا کہ یہ ہماری طرف سے آپ کے تعلیمی ادارہ کے لئے عطیہ ہے۔ تعمیری کام میں اتنی کشش ہے کہ لوگ اپنے آپ اس کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

حیدر آباد اور محبوب نگر کے پروگرام کے آخر میں بھوپال یونیورسٹی کے ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے اپنا آخری تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ حیدر آباد کے اس پروگرام میں شرکت کے بعد میرا یہ احساس ہے کہ حیدر آباد میں حلقۂ الرسالہ نئی طاقت کے ساتھ ابھرا ہے۔ حلقۂ الرسالہ کے افراد نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ مشن کو لے کر میدان میں آئے ہیں۔

مولانا سید اکبر الدین قاسمی صاحب نے یہاں کے پروگرام کے بارے میں اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ پروگرام مجموعی اعتبار سے بہت کامیاب، مفید اور موثر ثابت ہوئے۔ خاص طور پر اہل علم اور سنجیدہ حضرات نے بڑے ذوق و شوق سے اس میں حصہ لیا اور خطابات کو دلچسپی کے ساتھ سنا۔

حبیب بھائی نے حیدر آباد کے ان پروگراموں کے بارہ میں اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ سارے پروگرام ممتاز (excellent) رہے اور ایسا لگتا ہے کہ آپ کے خلاف جو غلط پروپگنڈا ہوا تھا وہ ان پروگراموں کے بعد بڑی حد تک دور ہو گیا۔

بھوپال سے ان پروگراموں میں شرکت کے لئے بلال الدین صاحب آئے تھے۔ حیدر آباد کے ان پروگراموں کے بارے میں انھوں نے اپنا یہ تاثر بتایا کہ میں شروع سے الرسالہ کو پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں اور آپ کی سب کتابیں بھی پڑھی ہیں مگر یہاں آکر ایسا محسوس ہوا کہ میں پھر سے الرسالہ مشن کا تعارف حاصل کر رہا ہوں۔

۷ فروری کی شام کو انگریزی روزنامہ دکن کرانیکل کے نمائندہ میر ایوب علی خاں صاحب نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو حبیب بھائی کی رہائش گاہ پر لیا گیا۔ انٹرویور نے مختلف قسم کے سوالات کئے۔ میری ذات کے بارے میں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا: موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے لمبی مدت تک ہمالیائی کوششیں کیں۔ مگر نتیجہ صفر رہا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ان کی یہ کوششیں رد عمل کے تحت وجود میں آئیں۔ وہ کسی مثبت فکر کا نتیجہ نہ تھیں۔ اس دنیا کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ مثبت فکر کے تحت وجود میں آنے والا عمل نتیجہ خیز ہو اور رد عمل کے تحت وجود میں آنے والا عمل بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔ یہ قانون ہر قوم کے لئے ہے، اس میں کسی کا استثناء نہیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جن لوگوں سے میرا اختلاف ہے وہ شخصی نہیں ہے بلکہ صرف نظریاتی ہے۔ آپ میری تحریروں کو پڑھیں آپ پائیں گے کہ میں کبھی کسی کی شخصی عیب جوئی نہیں کرتا بلکہ صرف اس کے مسلمہ فکر پر تنقید کرتا ہوں۔ میرے نزدیک شخصی عیب جوئی حرام ہے۔ اور نظریاتی تنقید و تجزیہ عین جائز بلکہ ضروری ہے۔ یہ انٹرویو مفصل طور پر دکن کرانیکل ۱۳ فروری ۲۰۰۰ میں چھپا ہے۔ اس انٹرویو کا کچھ حصہ اخبار سے لے کر اگلے صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

'People will follow money not RSS'

Maulana Waheeduddin Khan is a renowned scholar of Islam. The Maulana believes that a person can be pious and modern in outlook at the same time since, according to him, there is no clash between science and faith. Having a command over Arabic, Persian, English and Urdu the Maulana has been writing and speaking about peace between communities. He has written numerous books explaining various aspects of Islam to Muslims as well as non-Muslims. MIR AYOOB ALI KHAN met the Maulana during his visit to Hyderabad last week and made him speak his mind.

Q. *In your discourses and writings you take the support of science to reinforce religious beliefs. Religion and science are two different things. How can science that is based on reason support religion that is a matter of belief?*

A. The difference of approach between science and religion has disappeared with time. Earlier, science used to say that for an argument to be valid, it should be demonstrative. With the splitting of atom science is no more in a position to say that. It is talking about unseen things. That is what religion has always spoken about. Let us say that science follows the system of developing a hypothesis goes over to observation and comes up with verification. Religion also follows the same methodology to establish a statement. For example, let's say that the Quran is the book of God is a hypothesis. The statement in the Quran that God has saved the body of Pharoah who lived in the period of Prophet Moses was made 1300 years ago before it was discovered that his body actually had been preserved in a pyramid. This observation verifies that the Quran is the book of God.

Q. *According to many scholars, Muslims are taking to confrontation because their reconciliatory approach has failed; dawah work has failed.*

A. Peaceful methods never fail. Why should there be confrontation? Look at the stars in the sky. There are millions of them and they have always co-existed peacefully. Dawah work never fails, it is the violent activism that has failed.

Q. *There are people who believe that violence is an integral part of Islam. What do you think?*

A. I would reject this charge outright. Islam is a religion for all time. If it preached violence, no one would be left on this earth. And when there are no people, what would Islam do? One should always remember Islam preaches peace and harmony, not destruction and chaos.

Q. *What is your stand on the question of Babri Masjid now?*

A. Before the demolition of Babri Masjid I had advised Muslims to carry out their struggle peacefully; not to take it to the streets. After the demolition I say that the reconstruction of the Babri Masjid would mean destruction of the makeshift Ram Mandir, which is very difficult. Therefore, the Muslims should leave the question of Babri Masjid to the conscience of the nation. The agitation should end.

Q. *Government has given permission to its employees for attending RSS camps. What is your comment?*

A. The permission will not have any effect. The romantic era of the RSS when people wanted to attend its camps is gone. It is an era of MNCs where everybody is interested in making money. Not many people would be interested in wasting their time with the RSS meetings.

—*Deccan Chronicle, Hyderabad*, February 13, 2000

اجتماعات کے علاوہ یہاں مجلس کی صورت میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لوگوں سے اظہار خیال کا موقع ملا۔ یہ سب شہر کے تعلیم یافتہ مسلمان ہوتے تھے۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ جدید حیدر آباد میں مسلمانوں کی تعمیری سرگرمیاں بہت قابل قدر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا سنگل پوائنٹ فارمولا ایجوکیشن ہے۔ سر سید احمد خاں نے غالباً سب سے پہلے تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا۔ سر سید کا نقطۂ نظر ان کے ترجمان الطاف حسین حالی کے اس شعر میں ملتا ہے:

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

موجودہ زمانہ میں نہ صرف ہندستان میں بلکہ پوری مسلم دنیا میں سیکڑوں کی تعداد میں بڑے بڑے رہنما اٹھے۔ مگر سر سید کے سوا شاید کوئی نہیں جس نے حصول علم کو اشوبنا کر باقاعدہ تحریک چلائی ہو۔ لوگ دوسرے دوسرے عنوانات پر مسلم عوام کو ابھارتے رہے۔ مثلاً سید جمال الدین افغانی نے نو آبادیاتی نظام کے خلاف مہم چلائی۔ محمد علی جوہر نے ترک خلافت کے تحفظ کا ہنگامہ کھڑا کیا۔ سید قطب مصری نے سیاسی اقتدار کی تبدیلی کو سب سے بڑا کام سمجھا۔ آیت اللہ خمینی نے شاہ ایران کو اپنی تحریک کا نشانہ بنایا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایوب اور بھٹو کے خلاف تقریر اور تحریر کا غوغا برپا کیا، وغیرہ۔ حتیٰ کہ ان مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کو تعلیم سے روکنے کی کوشش کی۔ مثلاً اکبر الٰہ آبادی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی نے انتہائی بے شعوری کے تحت کالج اور یونیورسٹی کو قتل گاہ بتایا۔ اب مسلمانوں نے تعلیم حاصل کرنا شروع کیا ہے مگر یہ ان کے رہنماؤں کی رہنمائی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ وہ نئے حالات کی بنا پر ہے۔

ایک مجلس میں میرے خلاف اس تصویری فتنہ کی بابت سوال کیا گیا جس کی وضاحت ایک سال پہلے الرسالہ کے چند شماروں میں آچکی ہے۔ ہندستان کے قدیم اور مستند ادارہ دار العلوم دیوبند نے واضح طور پر میری موافقت میں فتویٰ دیا جو الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۹ میں چھپ چکا ہے۔

میں نے کہا اس فتنہ میں الذی تولی کبرہ (النور) کا کردار ایک نام نہاد اسلامی جماعت نے ادا کیا تھا۔ میرے جوابات اور مذکورہ فتویٰ کی اشاعت کے بعد یہ لوگ چپ ہو گئے۔ حالانکہ

اس طرح کے معاملہ میں چپ رہنا بھی جرم ہے۔ ان لوگوں کے اوپر فرض تھا کہ معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرتے۔ جس طرح انھوں نے جھوٹی تصویر کے معاملہ کی اشاعت کی تھی اسی طرح وہ اپنی مجرمانہ غلطی کے اعتراف کی بھی مکمل اشاعت کرتے۔ اس طرح کے معاملہ میں خاموشی بجائے خود ایک جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

وہ فتنہ یہ تھا کہ ایک بدنام ہندی اخبار ہے جس کا کام مشہور شخصیتوں کا کیریکچر (caricature) بنانا اور اپنے سطحی قارئین کو تماشہ کی چیزیں پڑھنے کے لئے دینا ہے۔ اس اخبار نے میرے بارے میں ایک لغو تصویر چھاپی۔ مذکورہ اسلامی جماعت نے اس بیہودہ تصویر کو لے کر اپنے نام نہاد میڈیا میں چھاپا اور اس کی فوٹو کاپی تیار کر کے نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں پھیلا دیا۔

پچھلے سال جب بھی میں کسی مشرقی یا مغربی ملک میں گیا وہاں میں نے دیکھا کہ تصویر کا یہ فتنہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام کی تاریخ میں شاید یہ پہلا انٹرنیشنل کرائم تھا۔ پچھلی صدیوں میں جب کہ تیز رفتار میڈیا موجود نہ تھا، کسی جھوٹ کو عالمی سطح پر پھیلانا بھی ممکن نہ تھا۔ جدید دور کے میڈیا نے پہلی بار اس کو ممکن بنایا ہے کہ کوئی شخص یا جماعت اس قسم کا انٹرنیشنل کرائم کر سکے۔ تعجب بات ہے کہ اس انٹرنیشنل کرائم کا کارنامہ اس جماعت نے انجام دیا جس نے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے اصول پر اپنا نام اسلامی جماعت رکھا ہے۔

میں نے کہا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس جھوٹے الزام سے مکمل طور پر بری ہوں۔ مگر جہاں تک مذکورہ اسلامی جماعت کا تعلق ہے وہ مبینہ طور پر ایک سنگین جرم کا ارتکاب کر چکی ہے۔ مذکورہ نام نہاد اسلامی جماعت نے بلاشبہہ اپنے اس مکروہ فعل سے اپنے آپ کو اکسپوز کر دیا ہے۔ یہ جماعت بزعم خود "مکمل اسلام" کے نفاذ کی علم بردار ہے۔ مگر اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مکمل اسلام قائم کرنے کے یہ علم بردار بظاہر جزئی اسلام پر بھی قائم نہیں۔

۷ فروری کی شام کو محبوب نگر سے واپس ہو کر ہم لوگ حیدر آباد میں داخل ہوئے تو رات کے ایک بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت سڑکوں کی صفائی ہو رہی ہے۔

جب کہ دہلی کے صفائی کرمچاری صبح کو دیر سے اس وقت صفائی کا کام شروع کرتے ہیں جب لوگوں کی آمد و رفت سڑکوں پر شروع ہو جاتی ہے۔ حیدر آباد میں اس طرح کی بہت سی قابلِ ستائش چیزیں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ پہلے ایسا نہ تھا۔ یہ نئی گورنمنٹ کے زمانہ میں ہوا ہے۔ یہاں میں جن لوگوں سے ملا سب نے موجودہ ریاستی حکومت کی حسنِ کارکردگی کا اعتراف کیا۔

یہاں کچھ لوگ میری قیام گاہ (بیگم پٹ) پر آئے اور بتایا کہ وہ احمدی جماعت (قادیانی جماعت) سے تعلق رکھتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے بارہ میں جو دعویٰ کیا اس کی بنیاد دو میں سے کسی ایک ذریعہ علم پر ہو سکتی ہے ـــــ سائنس یا قرآن۔ میں نے کہا کہ سائنس سرے سے اس کو نہیں مانتی کہ کوئی زندہ خدا ہے جو انسان کے اوپر الہام کرتا ہے۔ اس لئے سائنس آپ کے دعویٰ کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دعویٰ کی بنیاد قرآن ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کا اعلان کر چکا ہے۔ اس لئے قرآن کی بنیاد پر اس قسم کے دعوے کی سرے سے گنجائش نہیں۔ انھوں نے قرآن کی کچھ آیتیں (مثلاً تتنزل علیهم الملائکة) پیش کیں۔ میں نے کہا ان آیتوں سے مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے کی تائید نکالنا ایسا ہی ہے جیسے کچھ لوگ قرآن سے لفظ وڈا (مریم ۹۶) لے کر کہتے ہیں کہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ وید بھی قرآن کی طرح ایک آسمانی کتاب ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی باتیں استدلال نہیں بلکہ صرف اپنی بے علمی کا اشتہار ہیں۔

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ سماجی کام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ سماجی یا انسانی خدمت کے نام پر ایک کام شروع کریں اور غیر لوگوں سے تعاون کی اپیل کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ کسی سے کوئی اپیل نہ کریں۔ آپ صرف یہ کریں کہ جو مفید انسانیت کام آپ کے ذہن میں ہے اس کو اللہ کا نام لے کر شروع کر دیں اور اخلاص و دیانت کے ساتھ اس کی تکمیل میں لگ جائیں۔ اس کے بعد یہ یقینی ہے کہ لوگوں کا تعاون آپ کو حاصل ہونے لگے گا۔

ایک کام وہ ہے جس کے اچھا ہونے کا آپ اعلان کریں۔ دوسرا کام وہ ہے جس کا اچھا ہونا خود دوسروں کو دکھائی دیتا ہو۔ پہلی نوعیت کے کام میں بھی اگرچہ دوسروں کا تعاون ملتا ہے مگر دوسری نوعیت کے کام میں جو تعاون ملتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

حیدر آباد سے ایک انگریزی میگزین نکلتا ہے جس کا نام بھارتیہ پرجنا (Bharatiya Pragna) ہے۔ یہ آر ایس ایس گروپ کا میگزین ہے۔ یہاں میں نے اس کا شمارہ فروری ۲۰۰۰ دیکھا۔ اس کے صفحہ ۳۹ پر انڈیا کے بارے میں حقائق (Facts about India) کے عنوان کے تحت کئی باتیں درج تھیں۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ سترہویں صدی عیسوی میں انگریزوں کے حملہ سے پہلے انڈیا دنیا کا سب سے زیادہ امیر ملک تھا:

India was the richest country in the world till the time of the British Invasion in the early 17th century (p.39)

الفاظ کو بدل دیا جائے تو اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے حملہ سے پہلے مسلم عہد میں ہندستان دنیا کا سب سے زیادہ امیر ملک تھا۔

اس سفر نامہ میں اسی قسم کا ایک اور حوالہ میں نے درج کیا ہے جس میں یہ اقرار کیا گیا ہے کہ آزادی سے پہلے برٹش دور میں ہندستان دنیا کا ایک اعلیٰ ترقی یافتہ ملک تھا۔ مگر آزادی کے بعد پچاس سال تک ملکی حکمرانوں کے ہاتھ میں رہنے کے بعد اب انڈیا کا یہ حال ہے کہ وہ اقتصادی اعتبار سے دنیا کے ملکوں میں ۱۷۷ ویں نمبر پر ہے (ملاحظہ ہو زیر نظر الرسالہ کا صفحہ ۴۲)

جناب عبد الرحمٰن خاں صاحب (پیدائش ۱۹۵۸) الٰہ آباد بینک میں منیجر ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ سیاحت کے لئے حیدر آباد گئے۔ ۱۲ فروری ۲۰۰۰ کو وہ حیدر آباد پہنچے اور تین دن وہاں رہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ حیدر آباد کے بارہ میں اپنا کچھ تاثر بتائیے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اپنے تجربہ میں ایسا محسوس ہوا کہ حیدر آباد کے لوگوں میں نسبتاً انسانی اوصاف زیادہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حیدر آباد ایئرپورٹ پر ہم اترے تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے ٹیکسی کی ڈکی میں اپنا سامان رکھا اور پھر ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈرائیور نے ایک

پٹرول پمپ پر ٹیکسی کھڑی کی تو میں نے کہا کہ مجھے ڈکی سے کچھ نکالنا ہے۔ اس وقت میری زبان سے یہ نکلا کہ میں نے غلطی سے اپنا پرس ڈکی میں رکھ دیا ہے۔ اس پر ڈرائیور بولا کہ جناب، یہ حیدر آباد ہے، یہ دہلی نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے بیٹھئے۔ آپ کا سامان محفوظ ہے۔

اس کے بعد جب میں حیدر آباد پہنچ کر وہاں گھوما اور وہاں کے مختلف طبقات کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ ڈرائیور نے درست کہا تھا۔ یہاں کے لوگوں میں واقعۃً انسانیت ہے۔ استثناء (exception) تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ اور یقیناً یہاں بھی ہوگا۔ مگر یہاں کے لوگوں کو میں نے عام طور پر دوسروں سے بہتر پایا۔

حیدر آباد کے مسلمانوں میں تعلیمی سرگرمیاں بھی دوسرے مقامات سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ یہاں کا مولوی طبقہ اور مسٹر طبقہ دونوں کثرت سے تعلیمی ادارے قائم کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنانے میں مشغول ہیں۔

حیدر آباد میں ایک اور خاص چیز ہے جو شاید ہندستان کے کسی دوسرے شہر میں موجود نہیں۔ یہ صحافت ہے۔ حیدر آباد شہر ہندستان کا واحد شہر ہے جس کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کی ایک باقاعدہ صحافت ہے۔ یہاں کئی اچھے اخبارات نکلتے ہیں جو شہر کے بیشتر مسلم گھروں میں پہنچتے ہیں۔ یہ اخبارات حیدر آباد کے مسلمانوں کے درمیان مسلسل رابطہ کا کام کرتے ہیں۔ ان اخباروں کے ذریعہ یہاں کے مسلمان ہر روز ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے یہاں کے مختلف اخبارات دیکھے۔ ہر اخبار میں کسی نہ کسی صورت میں یہاں کے مسلمانوں کی دینی اور تعمیری سرگرمیوں کا تذکرہ تھا۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں حیدر آباد میں اردو زبان کا بہت چرچا تھا۔ ۱۹۱۹ میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی۔ اس کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ تمام مضامین بشمول سائنس یہاں اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ آج جامعہ عثمانیہ کو دیکھئے تو اس کا منظر بالکل مختلف دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد یہاں اردو زبان کو تنزل کا شکار ہونا پڑا۔ ۱۹۵۶ میں سنجیوا ریڈی آندھرا پردیش

کے پہلے چیف منسٹر بنے تو انھوں نے اردو کو ریاست کی دوسری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ تاہم اس کے بعد بھی عملی طور پر اردو کو سرکاری سرپرستی بہت کم حاصل ہوئی۔

مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ اردو زبان حیدر آباد میں آج پوری طرح زندہ ہے۔ اردو کو یہ زندگی سرکاری سرپرستی کے ذریعہ نہیں ملی بلکہ یہ خود اہل اردو کا کارنامہ ہے جو نامساعد حالات کے باوجود اردو کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

حیدر آباد کی اہمیت کا ایک اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امریکی صدر بل کلنٹن نے ہندستان کا دورہ (۱۹۔۲۵ مارچ ۲۰۰۰) کیا تو دہلی اور بمبئی کے ساتھ وہ حیدر آباد بھی گئے۔ عجیب بات ہے کہ ۷ فروری کو جب کہ میں حیدر آباد میں تھا اس وقت ہندستان کی پوری حکومت اور ملک کے دانشوروں کا پورا طبقہ اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کلنٹن پاکستان نہ جائیں۔ نئی دہلی کی سرکاری شخصیتیں مسلسل واشنگٹن پہنچ رہی تھیں۔ حتی کہ نئی دہلی نے امریکہ کی ایک لابی کرنے والی کمپنی کو بہت بڑی رقم دے کر ہائر کیا تھا کہ وہ کلنٹن کو پاکستان جانے سے روکے۔ اس کوشش میں ہندستان نے کثیر رقم خرچ کی۔ ۷ فروری کو حیدر آباد میں بعض ساتھیوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ امریکی صدر پاکستان نہ جائیں۔ میں جانتا تھا کہ اس قسم کی چیزوں کا تعلق لابینگ سے نہیں ہوتا بلکہ نیشنل انٹرسٹ سے ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہندستان کے لیڈر اور دانشور جو خود بھی ہمیشہ اپنے انٹرسٹ پر چلتے ہیں وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر رہے کہ امریکہ بھی اس معاملہ میں اپنے نیشنل انٹرسٹ کی بنیاد پر فیصلہ کرے گا اور اپنے دورہ میں پاکستان کو ضرور شامل کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بل کلنٹن نے ۲۵ فروری ۲۰۰۰ کو اسلام آباد کا دورہ کیا۔

۸ فروری ۲۰۰۰ کی صبح کو حیدر آباد سے واپس دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ حبیب بھائی کی رہائش گاہ سے روانہ ہو کر ہم لوگ ایئرپورٹ جا رہے تھے۔ حیدر آباد کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے راستہ میں ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اس دنیا میں کسی انسان کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ اس کا دل دوسروں کے لئے کھلا ہوا ہو۔ لوگوں کے لئے اس کے

دل میں شفقت اور خیر خواہی کا جذبہ ہو۔ وہ فیاضی کے ساتھ لوگوں کے کام آتا ہو۔ صرف انہیں لوگوں کے ساتھ نہیں جن سے اس کو ریٹرن کی امید ہو بلکہ ہر ایک کے ساتھ۔ مثلاً ایک آدمی اسکوٹر رکشا پر بیٹھے اور ایک کیلو میٹر تک جاکر اتر جائے پھر اس کے میٹر پر بحث کئے بغیر اس غریب رکشہ والے کو سو روپیہ کا نوٹ دے دے تو اس قسم کا فیاضانہ سلوک اس کی طرف اسی دنیا میں بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ لوٹتا ہے۔ بے غرضی، سادگی، سخاوت، انسانی خیر خواہی، کھلے دل کے ساتھ سلوک، حق سے زیادہ اپنی ڈیوٹی کا احساس، اس قسم کے اوصاف اعلیٰ ترین انسانی اوصاف ہیں اور جس آدمی کے اندر یہ اوصاف ہوں، اس کی کامیابی میں کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

۸ر فروری کی صبح کو جہاز حیدر آباد سے آدھ گھنٹہ کی تاخیر کے ساتھ روانہ ہوا۔ جہاز کے اندر پڑھنے کے لئے مختلف اخبارات موجود تھے۔ دکن کرانیکل کا شمارہ ۸ فروری ۲۰۰۰ دیکھا۔ مشہور صنعت کار مسٹر وجے پتھ سنگھانیا کے قلم سے ایک مضمون تھا جس کا عنوان یہ تھا ــــــ کامیابی ہندستان میں غیر مقیم ہے:

Success is non-resident in India.

اس مضمون میں چند مثالوں کے ذریعہ دکھایا گیا تھا کہ ایک ہندستانی ہندستان میں ناکام رہتا ہے اور وہی ہندستانی باہر کے ملک میں جاکر بڑی بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس کا سبب مضمون میں یہ بتایا گیا تھا کہ آزادی کے بعد ہندستان میں بے شمار سوشلسٹ قوانین بنائے گئے۔ ان قوانین کے ذریعہ ایسی مصنوعی پابندیاں ملک میں رائج کی گئیں جو حوصلہ مند ہندستانیوں کے لئے پاؤں کی زنجیر بن گئیں۔

اس معاملہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا تھا کہ آزادی کے وقت ہندستان تمام نو آبادیاتی ملکوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔ اور اس کا مستقبل بہت روشن تھا۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ جی این پی کے اعتبار سے ہندستان دنیا کے ۲۰۹ ملکوں میں ۱۷۷ ویں نمبر پر ہے۔

At Independence, India was among the most advanced of all the

colonies with brilliant prospects for the future. Today with a GNP per head of US $370, it occupies a lowly 177th position among 209 countries of the world.

اس بچھڑے پن کا واحد سبب یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن لیڈروں کے ہاتھ میں انڈیا کی قسمت آئی انھوں نے اس کو غلط رخ پر چلادیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہندستانی لیڈر اگر کچھ نہ کرتے اور آزادی سے پہلے والے نظام کو بدستور ملک میں باقی رکھتے تو یقینی ہے کہ ملک کا حال آج اس سے بہت بہتر ہوتا جو اس وقت نظر آرہا ہے۔

دکن کرانیکل کے اسی شمارہ (۸ فروری) میں لیٹرس کے کالم میں ایک ہندو کا ایک خط Outmoded Religion کے عنوان سے چھپا تھا۔ یہ خط یہاں بلا تبصرہ نقل کیا جاتا ہے:

This is with reference to Mohan Guruswamy's article "Who will bell the Hindu cat?" I agree with the writer that Hinduism is entrapped in meaningless rituals and is divorced from the needs of modern day living. Unless we have the courage to weed out these outmoded practices, India will not be able to progress. (A B Prakash, Hyderabad)

دو گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز جب دہلی کے اوپر پہنچا تو کمانڈر نے اعلان کیا کہ جہاز کے اترنے میں کچھ دیر لگے گی:

There will be some delay in landing.

جہاز دہلی کے اوپر گولائی میں تقریباً پینتالیس منٹ تک پرواز کرتا رہا۔ بتایا گیا کہ ایرپورٹ پر گہرے کہر کی وجہ سے رؤیت (visibility) بہت کم ہے۔ اس لئے جہاز وہاں اتر نہیں سکتا۔ آخر کار پائلٹ نے اعلان کیا کہ دہلی میں اس وقت اترنا ممکن نہیں۔ اس لئے اب جہاز یہاں سے بمبئی جارہا ہے۔ اس وقت جہاز کے چاروں طرف سورج چمک رہا تھا۔ جہاز کے چاروں طرف مکمل روشنی تھی۔ اگر آدمی نہ جانے کہ کہر نیچے زمین کی سطح پر ہے اور ہم اس کے اوپر ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہے ہیں، تو وہ سمجھے گا کہ پائلٹ غلط بیانی کر رہا ہے۔ کسی معاملہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہ کافی نہیں کہ آپ اپنی قریبی دنیا کو دیکھ رہے ہوں۔ آپ کو گرد و پیش سے باہر کی دنیا کو بھی

جاننا ہوگا جو آپ کے قریب کی دنیا سے بالکل مختلف مگر حقیقی طور پر موجود ہے۔

یہ میرے لئے ایک وحشت خیز تجربہ تھا۔ مگر اس مسئلہ پر سوچتے ہوئے ایک اہم حقیقت میری سمجھ میں آئی۔ میں نے سوچا کہ دہلی ائرپورٹ پر گہرے کہر کی وجہ سے یہ حالت ہے کہ وہاں کے لوگوں کو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ جبکہ عین اسی وقت اوپر کی فضا میں ہر چیز پوری طرح روشن ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں افکار و نظریات کی کثرت نے ایسی حالت پیدا کر دی ہے جس کو ذہنی کہر آلودگی (Befogging of the mind) کہا جاسکتا ہے۔ لوگ دماغ رکھتے ہوئے کچھ نہیں سوچ پاتے۔ ذہنی کہر آلودگی کے اس مسئلہ نے لوگوں کو حقیقت کے معاملہ میں اندھا اور بہرہ بنادیا ہے۔

اس "کہر" سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی فکری سطح کو بلند کرلے۔ وہ کہر سے اوپر اٹھ کر وہاں پہنچ جائے جہاں ہر چیز روشن ہے۔ اسی کو اسلام میں زہد کہا گیا ہے۔ زہد آدمی کو مادیات سے اٹھا کر اس بلند فکری اور روحانی سطح پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ ذہنی کہر آلودگی سے بچ کر بے آمیز روپ میں سوچ سکے۔ اور حقیقتوں کو غیر مشتبہ انداز میں دریافت کرلے۔

جہاز دہلی سے روانہ ہو کر دو گھنٹہ بعد بمبئی پہنچا۔ بمبئی ائرپورٹ پر جہاز تقریباً ایک گھنٹہ ٹھہرا۔ تمام مسافر جہاز کے اندر بیٹھے رہے۔ جہاز نے یہاں سے دوبارہ پرواز کی اور پھر دوبارہ دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ بمبئی سے دہلی تک کی پرواز دو گھنٹہ میں پوری ہوئی۔ ۸ فروری ۲۰۰۰ کو شام چار بجے جہاز دہلی پہنچ گیا۔

جہاز کا حیدر آباد سے دہلی پہنچ کر وہاں نہ اتر سکنا، کچھ دیر فضا میں منڈلانے کے بعد اس کا بمبئی آنا اور پھر یہاں سے دوبارہ دہلی جانا، یہ گویا ایک بحران کا واقعہ تھا۔ مجھے ایک قول یاد آیا کہ آدمی کی صلاحیت بحران میں پہچانی جاتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں کمیونی کیشن نے بحران سے نمٹنے کے معاملہ کو بہت آسان بنادیا ہے۔ ہوائی جہاز کے مسافروں میں سے اکثر کے پاس موبائیل ٹیلی فون تھا۔ انھوں نے جہاز کے اندر

سے ٹیلی فون کر کے اپنے گھروں سے ربط قائم کیا۔ اسی قسم کا ایک تاریخی واقعہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ کو کراچی ائرپورٹ پر پیش آیا۔ جنرل پرویز مشرف کولمبو سے کراچی آرہے تھے۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف نے کراچی ائرپورٹ پر احکام بھیج دئے کہ جہاز وہاں اترنے نہ پائے۔

جنرل پرویز مشرف کے لئے یہ ایک بحران کی حالت تھی۔ مگر موبائیل ٹیلی فون ان کے کام آیا۔ انھوں نے فضا سے موبائیل ٹیلی فون کے ذریعہ کراچی کے اعلیٰ فوجی افسر سے ربط قائم کیا۔

رپورٹ کے مطابق، کراچی کے فوجی افسران فوراً حرکت میں آگئے۔ انہوں نے کراچی ائرپورٹ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس کے بعد وہ ائرپورٹ کے کنٹرول روم میں پہنچے۔ اس وقت جنرل پرویز مشرف کا جہاز فضا میں منڈلا رہا تھا۔ افسروں نے دوبارہ ربط قائم کر کے جہاز کے پائلٹ سے کہا کہ تم اپنا جہاز کراچی کے ائرپورٹ پر اتارو۔ ایک طرف کراچی میں یہ ڈرامہ ہوا اور دوسری طرف اسلام آباد میں فوج نے تیزی سے حرکت کر کے وزیر اعظم کی رہائش گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اور نواز شریف کو گرفتار کر کے انہیں نظر بند کر دیا۔ یہ ساری تیز رفتار کارروائی جدید کمیونیکیشن کے ذریعہ ممکن ہوئی۔

۸ فروری ۲۰۰۰ کو میں کسی قدر تاخیر کے ساتھ دہلی پہنچا۔ میں نے سوچا کہ اس سفر میں میرے ساتھ کئی ناموافق واقعات پیش آئے۔ تاہم آخر کار میں سفر سے واپس ہو کر اپنے گھر آگیا۔ مگر زندگی کا ایک اور سفر ہے جس میں واپسی ممکن نہیں۔ یہ موت کا سفر ہے۔ موت کے سفر کا سب سے زیادہ بھیانک پہلو یہ ہے کہ اس میں صرف جانا ہے، اس میں لوٹنا نہیں ہے۔ کیسا عجیب لمحہ ہوگا جب انسان پر یہ کھلے گا کہ اس نے زندگی کے پچھلے دور میں ایسی کوتاہیاں کی ہیں جن کا بھیانک انجام اسے لازمی طور پر زندگی کے اگلے دور میں بھگتنا ہے۔ مگر اب یہ موقع نہیں کہ وہ دوبارہ پچھلی زندگی میں جائے۔ اور مطلوب عمل کر کے آخرت میں پہنچے۔ دنیا میں کسی انسان کے لئے سب سے زیادہ غم کی بات یہ ہوتی ہے کہ ایک موقع اس کے سامنے آیا مگر وہ اس کو

استعمال نہ کر سکا۔ یہی غم زیادہ شدید انداز میں آخرت میں انسان کو لاحق ہوگا۔ کھوئے ہوئے مواقع (missed opportunities) کی تلخ یاد موجودہ دنیا میں بھی آدمی سے اس کا سکون چھین لیتی ہے پھر آخرت میں کھوئے ہوئے مواقع کی تلخ تر یاد آدمی کو کتنا زیادہ بے چین کرے گی اس کا اندازہ کرنا آج کے حالات میں ممکن نہیں۔

حیدر آباد سے واپسی کے بعد وہاں کے ایک صاحب نے حیدر آباد کے روزنامہ منصف (۱۱ر فروری ۲۰۰۰) میں چھپا ہوا ایک مراسلہ بھیجا۔ اس کے مراسلہ نگار صفدر حسین (اکبر باغ) تھے۔ اس مطبوعہ مراسلہ کا ایک اقتباس یہ ہے ــــ "ہمارے خیال میں مولانا وحید الدین جیسا پایہ کا عالم ڈھونڈے سے بھی ہندوپاک میں نہیں ملے گا۔ حال ہی میں مولانا نے حیدر آباد میں ایک خطاب کیا جس کا عنوان یہ تھا: اکیسویں صدی میں اسلام۔ مولانا موصوف نے اپنے فکر انگیز خطبے میں جہاں بہت سی اچھی باتیں بتائیں وہیں سب سے اچھی اور کارگر بات یہ کہی کہ ہندستان کے مسلمانوں کو غیر مسلم اکثریت سے نمٹنے کے لئے "یک طرفہ صبر" کی پالیسی اختیار کرنا چاہئے۔ اس کو اگر پھیلائیں تو بات قدم بوسی تک پہنچتی ہے۔ ہمارے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے اس یک طرفہ صبر کی وضاحت فرمائیں تو ہم چین کی نیند سو سکیں گے"۔

یہ شک و شبہہ تمام تر غلط فہمی کی بنا پر ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں جو بات کہی تھی وہ صبر برائے صبر نہیں تھی بلکہ صبر برائے استخدام فُرَص (استعمالِ مواقع) تھی۔ میں جب صبر کی بات کرتا ہوں تو وہ کسی کے آگے جھکنے کے لئے نہیں بلکہ مواقع دعوت کو استعمال کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ آپ کسی بھی امکان کو اس حکمت کے بغیر اپنے حق میں استعمال نہیں کر سکتے۔ مزید یہ کہ دعوتی کام کے لئے صبر کی ضرورت صرف ہندستان میں نہیں بلکہ تمام ملکوں میں ہے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ حکیمانہ صبر کے اسی اصول کو استعمال کر کے تبلیغی جماعت اور تمام اسلامی ادارے ترقی کر رہے ہیں۔ حتی کہ ہر مسلمان جو اپنے ذاتی معاملات میں کامیاب ہے وہ اسی حکمتِ صبر کو استعمال کرنے کی وجہ سے کامیاب ہے۔ صبر فطرت کا ایک اصول ہے۔ اس اصول کو

استعمال کئے بغیر اس دنیا میں کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

میں نے اپنے خطاب میں غیر مسلموں سے "نمٹنے" کی بات نہیں کہی تھی بلکہ موجود مواقع کو استعمال کرنے کی بات کہی تھی۔ میں اس نظریہ کو بالکل بے بنیاد سمجھتا ہوں کہ ہندستان یا دوسرے ملکوں کے غیر مسلم لوگ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور ہمارے لئے یہ مسئلہ ہے کہ ہم ان کی دشمنی اور سازش سے کس طرح نپٹیں۔ میرے نزدیک موجودہ دنیا فکر و عمل کی آزادی کی دنیا ہے۔ آج کی دنیا میں ہمیں جس چیلنج کا سامنا ہے وہ اپنی نوعیت میں عملی نہیں ہے بلکہ فکری ہے۔ ہمارے لئے کسی کی طرف سے عملی زیادتی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فکری چیلنج کا مسئلہ ہے۔ دور سائنس میں پیدا ہونے والے افکار اسلامی عقائد کو چیلنج کر رہے ہیں۔ یہ ایک فکری اور نظریاتی چیلنج ہے اور ہمیں فکری اور نظریاتی سطح پر اس کا جواب دینا ہے۔ میری کتاب مذہب اور جدید چیلنج اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لئے مختلف مقامات پر غیر مسلم قوموں کی طرف سے جن "زیادتیوں" کا مسئلہ ہے وہ نااہل مسلم لیڈروں کی نادانیوں کی بنا پر پیدا ہوا ہے نہ کہ غیر مسلموں کی طرف سے کسی مفروضہ دشمنی کی بنا پر۔ اگر یہ مسلم لیڈر ملک و مال کے لئے چلائی جانے والی اپنی سطحی سیاست کو چھوڑ دیں اور دعوت کو اپنا میدان عمل بنالیں تو اس قسم کی زیادتیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

میں حیدر آباد سے واپس ہو کر دہلی پہنچا تو ڈاک میں جو خطوط ملے ان میں سے ایک خط آندھرا پردیش کے چیف منسٹر چندرا بابو نائیڈو کا تھا۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ چندرا بابو نائیڈو میری تحریریں پڑھتے رہے ہیں اور میرے تعمیری مشن کی قدر کرتے ہیں۔ ان کا یہ خط یہاں اگلے صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ہندوستان کی مسلم تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اب تک اس ملک میں یہ حال تھا کہ یہاں کے ہندو لوگ مسلم علماء یا مسلم رہنماؤں کے نام سے جن

NARA CHANDRA BABU NAIDU

HYDERABAD
Dt: 27-1-2000

CHIEF MINISTER
ANDHRA PRADESH

Dear Sri Moulana Waheeduddin Khan ji,

I am happy to know that you have been bestowed with the honour of Padma Bhushan on the Republic Day in recognition of your attainment of excellence in your field and services to the society and the nation. I take this opportunity to convey my best wishes and congratulate you on achieving the honour.

We, in Andhra Pradesh are striving continuously for excellence in all fields and develop the State as Swarna Andhra Pradesh, a State guided by excellence, powered by knowledge and driven by wisdom.

I am sure you will continue to contribute for the progress and prosperity of the nation.

With regards,

Yours sincerely,

(N.CHANDRABABU NAIDU)

Maulana Wahiduddin Khan,
C-29, Nizamuddin West,
New Delhi - 110 013

مسلمانوں کو جانتے تھے ان کی پہچان ان کے نزدیک صرف یہ تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے وکیل ہیں وہ مسلمانوں کے ملی مفادات پر لکھتے اور بولتے ہیں نہ کہ تمام لوگوں کے مفادات پر۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ انہوں نے راقم الحروف کی صورت میں غالباً پہلی بار ایک ایسے مسلم عالم یا مسلم رہنما کو دریافت کیا ہے جس کی پہچان ان کی نظر میں غیر فرقہ وارانہ ہے۔ جس کی سوچ پورے ملک اور پوری انسانیت پر مبنی ہے۔ جو ان کے نزدیک ہندوؤں کا بھی اتنا ہی خیر خواہ ہے جتنا کہ مسلمانوں کا۔

میں پچھلے بیس سال سے برابر حیدر آباد جاتا رہا ہوں۔ اور وہاں کے مختلف پروگراموں میں شرکت کرتا رہا ہوں۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ میرے جلسوں میں کچھ پرجوش نوجوان میری باتوں پر اعتراض کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یا وہاں کے مسلم اخباروں اور رسالوں میں میرے خلاف مراسلے اور مضامین چھپتے تھے۔ مگر موجودہ سفر میں اس قسم کی کوئی منفی مثال سامنے نہیں آئی۔ عام طور پر میرے خیالات کی تائید کی گئی، افراد کی طرف سے بھی اور پریس کی طرف سے بھی۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پہلے میری جو بات لوگوں کو صرف ایک خیالی نظریہ معلوم ہوتی تھی وہ اب ایک عملی واقعہ بن چکی ہے۔ آزادی کے بعد کے زمانے میں ملک کے تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان صرف یہ لکھنا اور بولنا جانتے تھے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے کوئی اسکوپ نہیں۔ جب کہ میں یہ کہتا تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کا اسکوپ مکمل طور پر موجود ہے۔ چنانچہ الفاظ کے جنگل میں اس وقت میری بات لوگوں کو اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب دو اور دو چار کی طرح لوگوں کو دکھائی دے رہا ہے کہ میں جو بات کہتا تھا وہی درست بات تھی۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کے بارے میں یہ بات میں ۱۹۴۷ کے بعد سے ہی کہتا رہا ہوں۔ اگر نااہل رہنماؤں اور دانشوروں کی لفظی غوغا آرائی نے مسلمانوں کو گمراہ نہ کیا ہوتا تو آج وہ اپنی موجودہ حالت سے کئی گنا زیادہ ترقی کر چکے ہوتے۔

معروف صحافی مسٹر سعید سہروردی کا ایک مضمون حال میں چھپا ہے جس کا عنوان ہے: کھنڈروں کے بیچ چند مینار۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں کئی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ ہندستان

کے مسلمان غیر معمولی ترقی کر رہے ہیں۔ مثلاً عظیم ہاشم پریم جی، یوسف خواجہ حمید، ہابیل الیف خوراکی والا، شہناز حسین، ارشاد مرزا، وغیرہ۔ اس کے بعد مسٹر سعید سہروردی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: "اس تجزیہ سے مولانا وحید الدین کی اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ جو مسلمان ترقی کرنا چاہتے ہیں، تعصب اور امتیاز ان کی راہ کا پتھر نہیں بن سکتے" (روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی ۱۰ جنوری ۲۰۰۰)

یہ چند مسلم نام وہ ہیں جنھوں نے حالیہ برسوں میں امتیازی ترقی کی ہے۔ تاہم جیسا کہ میں بار بار کہتا رہا ہوں یہ اقتصادی انفجار (economic explosion) کا زمانہ ہے۔ آج کی دنیا میں اقتصادی مواقع کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ چنانچہ اپنی کوشش کے بقدر ان ترقیاتی مواقع میں ہر مسلمان اپنا حصہ پا رہا ہے۔ ۱۹۴۷ کی حالت سے تقابل کیا جائے تو آج یہاں کا ہر مسلم خاندان پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آئے گا۔

برصغیر ہند میں سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت سے مسلم رہنما اور دانشور لوگ مسلمانوں کو ایک ہی سبق دے رہے تھے۔ وہ یہ کہ فلاں فلاں رکاوٹ جب تک دور نہ ہو جائے اس وقت تک یہاں کے مسلمانوں کے لئے ترقی کے مواقع نہیں۔ انگریزوں کا سیاسی اقتدار، ہندو اکثریت کا تعصب، آر ایس ایس جیسی تنظیموں کی مسلم دشمنی، فرقہ پرستوں کی طرف سے دوسرا اسپین بنانے کا منصوبہ، وقت کے ابولہب اور ابوجہل کی تخریبی سازشیں، وغیرہ۔

مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے سو سال سے بھی زیادہ مدت سے مسلمانوں کو یہی سبق دے رہے تھے۔ مگر اب واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سب بے دانشی اور بے خبری کی آوازیں تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اپنی دنیا میں مواقع اور امکانات اتنے زیادہ رکھے ہیں کہ کوئی دشمن یا غیر دشمن کسی کا راستہ روک نہیں سکتا۔

اس معاملہ کی ایک چشم کشا مثال یہ ہے کہ نہ صرف برصغیر ہند میں بلکہ پوری مسلم دنیا میں آج سب سے زیادہ دولتمند شخص ہندستان کا ایک مسلمان ہے۔ وہی ہندستان جس کے بارے

میں ہمارے علماء اور دانشور مسلسل یہ انکشاف کر رہے تھے کہ یہاں مسلم ملت کا وجود مٹانے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ یہ ہندستانی مسلمان، ۵۵ سالہ مسٹر عظیم ہاشم پریم جی ہیں۔ ان کے بارے میں میڈیا میں بہت سی رپورٹیں آچکی ہیں۔ نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (۱۹ فروری ۲۰۰۰) میں ان کے بارے میں ایک رپورٹ چھپی ہے جس کا عنوان ہے دنیا کا دوسرا سب سے زیادہ دولتمند آدمی: The second richest man in the world

اس رپورٹ کے کچھ الفاظ یہ ہیں ـــــ بادشاہ، ملکہ، سلطان، عرب شیخ، سب راستہ سے ہٹ جاؤ۔ خوش آمدید، ہاشم پریم جی، دنیا کا دوسرا سب سے زیادہ امیر آدمی، ولیم گیٹ کے بعد، عظیم ہاشم پریم جی اس وقت 35.30 بلین ڈالر کے مالک ہیں۔

Move over, Kings, Queens, Sultans, and Oil Shaykhs. Welcome, Azim Hashim Premji, The second richest man in the world after William Gates. Premji is now worth $ 35.30 billion.

عظیم ہاشم پریم جی کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ اس کی تفصیل نئی دہلی کے پندرہ روزہ انڈیا ٹوڈے (India Today) کے شمارہ ۶ مارچ ۲۰۰۰ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس شمارہ کی ۸ صفحہ کی کور اسٹوری عظیم ہاشم پریم جی کی بارہ میں ہے۔ اس میں ایک مفصل انٹرویو بھی شامل ہے جس میں عظیم ہاشم پریم جی اپنا نقطۂ نظر بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی میں دو چیزیں سب سے زیادہ اہم ہیں: مدبرانہ بصیرت اور اخلاقی اقدار۔

Vision is like a lighthouse which shows the way.
If vision gives direction, values set boundaries.

یہ سفر نامہ (مشاہدات دکن) علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ زیادہ تعداد میں خریدنے کی صورت میں خصوصی رعایت۔ تفصیل کے لئے دفتر سے خط و کتابت کریں۔

ISLAMIC BOOKS

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Islam and Peace	Rs. 150.00
Principles of Islam	145.00
The Quran for All Humanity	75.00
Indian Muslims	65.00
God Arises	125.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
Islam As It Is	70.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Religion and Science	45.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	10.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Qur'an: An Abiding Wonder	145.00
The Call of the Qur'an	95.00
The Moral Vision	145.00
Introducing Islam	195.00

Books by other authors

The Qur'an Tr. T.B. Irving	Rs. 295.00
The Koran Tr. M.H. Shakir	195.00
Heart of the Koran by Lex Hixon	195.00
The Moral Values of the Quran by Harun Yahya	125.00
The Essential Arabic by Rafi'el-Imad Faynan	200.00
Presenting the Qur'an by Saniyasnain Khan	125.00
The Wonderful Universe of Allah by Saniyasnain Khan	85.00
The Soul of the Qur'an by Saniyasnain Khan	145.00
Tell Me About Hajj by Saniyasnain Khan	295.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia Ruqaiyyah Waris Maqsood	325.00
After Death, Life! Ruqaiyyah Waris Maqsood	195.00
Living Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
A Basic Dictionary of Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
The Muslim Marriage Guide Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
The Beautiful Commands of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	125.00
The Beautiful Promises of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	175.00
Muslim Travel Guide (Forthcoming) Ruqaiyyah Waris Maqsood	—
Muhammad: A Mercy to all the Nations by Q. A. Jairazbhoy	250.00
A-Z Steps to Leadership by Abdul Ghani Ahmed Barrie	95.00
The Sayings of Muhammad by Sir Abdullah Suhrwardy	75.00
The Life of the Prophet Muhammad by Mohd. Marmaduke Pickthall	75.00

Finest collection of books on Islam

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2000
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2000